نو آبادیاتی انتظامی ڈھانچے کا تسلسل

(سانجھ کی تیسری کتاب)

محمد مسعود خالد

سانجھ

Sanjh Lok Raj

فہرست مضامین

☆	کتابچہ لکھنے کی غرض و غایت (پیش لفظ)	3
1	سماجی ڈھانچہ	5
2	جاگیرداری پیداواری تعلقات	21
3	بیوروکریسی	29
4	فوج	38
5	مارشل لاء	46
6	سبز انقلاب	49
7	تحریک نظام مصطفیٰ	59
8	گڈ گورننس	71
9	جمہوری انقلاب	78

Sanjh Lok Raj

کتابچہ لکھنے کی غرض و غایت

آج اکیسویں صدی کے آغاز میں دنیا کی ہر قوم پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ جب تک وہ معاشی لحاظ سے مضبوط و مستحکم نہیں ہوتی اس وقت تک وہ دنیا میں باعزت اور آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں کر سکتی۔ اس مسلمہ حقیقت کے پیش نظر سانجھ کی فکری تحریک کا مقصد پاکستان کی نوجوان نسل کو پاکستان کی معاشی بدحالی کی مادی وجوہات یعنی کالونیل سسٹم سے آگاہ کرنا اور پاکستان میں کالونیل سسٹم کے محافظ طبقوں اور اداروں کے کردار سے روشناس کروانا ہے۔ تاکہ ان طبقات سے نجات حاصل کر کے اور ان اداروں کے کردار میں تبدیلی کر کے ہم بھی دنیا میں باعزت مقام حاصل کرنے کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتا دیکھ سکیں۔ سانجھ کی فکری تحریک کا مقصد پاکستانی قوم کے نوجوانوں کو فکری طور پر اس قابل بنانا ہے کہ وہ آنے والے معاشی، سیاسی اور سماجی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

سانجھ کی فکری تحریک کا مقصد نوجوانوں کو سوچنے کا عادی بنانا ہے، کسی مخصوص سوچ کے سانچے میں ڈھالنا نہیں۔ آج ہر شخص جانتا ہے کہ تانگے کا مکینک خلائی راکٹ کو ٹھیک نہیں کر سکتا۔ اس طرح پرانے خیالات و نظریات بھی جدید مسائل کو حل کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ سانجھ کی فکری تحریک جدید معاشی مسائل کو جدید علوم کے ذریعے سمجھنے اور ان کا جدید حل تلاش کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔

ہمارے بہت سے دانشور ٹھیک سمجھ رہے تھے کہ جدید سائنسی آلات کے بڑھتے ہوئے استعمال سے، جدید میڈیکل ٹیکنالوجی کے طریقہ علاج کے بڑھتے ہوئے رجحانات

SanjhLokRaj

سے، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب اور سائنسی ایجادات کی فراہم کردہ آسائشوں کی وجہ سے لوگوں کی سوچ خود بخود لبرل اور ترقی پسند ہوتی چلی جائے گی۔ یعنی مادی حالات میں تبدیلی از خود خیالات میں تبدیلی کا باعث بنے گی۔ مگر دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ ایسے ممالک جو اپنے شہریوں کو آئیڈیالوجی کے نام پر بنیاد پرستی کی دلدل میں پھنسائے رکھنے پر بضد ہیں اور وہ ممالک جن میں کالونیل مفادات کو بنیاد پرستی ہی کو قائم رکھ کر محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ وہاں مادی حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر فکری تحریکوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ فکری تحریکیں مادی حالات میں تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہونے والے خیالات کی پرورش کر سکیں۔

انقلاب سماجی تبدیلی کا آخری مرحلہ ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ سماجی تبدیلی کا 100 واں درجہ ہے۔ سانجھ صفر سے 1 تک درجہ کی تبدیلی کے ابتدائی مرحلہ پر کام کر رہی ہے۔ کوئی فکر جب تک کوئی عملی شکل اختیار نہیں کرتی تب تک وہ محض وہم و گمان یا عقیدہ رہتی ہے۔ کسی فکر کی سچائی اس فکر کے عمل میں آنے سے ثابت ہوتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے سائنسی مفروضہ کسی پریکٹیکل میں سچ یا غلط ثابت ہوتا ہے۔ جبر و استحصال کے کسی نظام سے نجات حاصل کرنے کے لیے آزاد ہونے کا کوئی عقیدہ یا خواہش رکھنا کافی نہیں۔ اس کے لیے عام لوگوں کو خود سیاست میں حصہ لینا پڑے گا۔ اپنی ایک انقلابی پارٹی کے ذریعے تبدیلی کے عمل کو شروع کرنا پڑے گا یا پہلے سے موجود کسی انقلابی پارٹی میں شرکت کرنی پڑے گی۔

سانجھ کی تیسری کتاب میں کالونیل ریاستی نظام کے اداروں، کالونیل نظام کے پیدا کردہ طبقوں اور ان کی سیاسی حیثیت اور کردار پر بحث کی گئی ہے۔ اس طرح یہ دوسرے کتابچے کا تسلسل بھی ہے اور الگ سے ایک کتاب بھی۔ ایک چھوٹی سی کتاب میں بعض تفصیلات کا رہ جانا قدرتی امر ہے۔ سانجھ کے ممبران کی تعلیم کے لیے جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ پاکستان کے کالونیل نظام کی قیدی بے زبان رعایا کی آزادی کے نقطہ نظر سے لکھا جاتا ہے۔

محمد مسعود خالد

0300-6943894

Sanjh Lokraj

سماجی ڈھانچہ

ڈھانچے کا لفظ سنتے ہی ہمارے ذہن میں ہڈیوں کے کسی ڈھانچے کا تصور آ جاتا ہے۔ بڑے بڑے جانوروں، پرندوں اور انسانوں میں ہڈیوں کی ایک خاص بناوٹ ہوتی ہے۔ ہڈیوں کی اس بناوٹ ہی کو ڈھانچہ کہتے ہیں۔ چونکہ الگ الگ جانوروں کے ڈھانچے الگ الگ ہوتے ہیں اس لیے ان کی ظاہری شکل بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے کھدائیوں میں لاکھوں کروڑوں سال سے دفن ڈائنو سار کے کچھ ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں۔ سائنسدانوں نے ان پر تصوراتی گوشت پوست لگا کر سینکڑوں قسم کے ڈائنو ساروں کی الگ الگ شکل اور قسم واضح کی ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں اگر مختلف قسم کے جانوروں کی ہڈیوں کے ڈھانچے ہمارے پاس موجود ہوں اور ان پر ہم گوشت پوست بھریں تو اس کی اصل شکل وجود میں لا سکتے ہیں۔

ڈھانچے اور اس کی ظاہری شکل میں ایک مطابقت ہوتی ہے۔ جیسے ہمارے پاس اگر زرافہ کا ڈھانچہ ہو تو اس پر گوشت پوست بھرنے سے انسان کی شکل وجود میں نہیں آ سکتی۔ ڈھانچہ جو بظاہر چھپا ہوتا ہے مگر ظاہری شکل اسی کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ معاشرہ یا سماج بھی ایسا ہی ہے۔ اس کی ظاہری شکل اس کا ریاستی نظام ہوتا ہے۔ مگر یہ ظاہری شکل اس کے اندر موجود معاشی ڈھانچے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب ہم سماج کے لیے ڈھانچے کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہ بات پہلی نظر میں ہمیں عجیب سی لگتی ہے کہ سماج کا بھی کوئی ڈھانچہ ہوتا ہے؟ کیونکہ ہمارے نزدیک تو سماج کسی خاص علاقے میں رہنے والے کروڑوں پر مشتمل آبادی کا نام ہے۔ جس میں مرد ہیں، عورتیں ہیں، بوڑھے ہیں بچے ہیں اور بس۔ یہ سب مل کر زندگی

Sanjh Lok Raj

گزارتے ہیں اور اس سے آگے کچھ نہیں۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان پیدا ہوتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن سماج ایک نظام کی حیثیت سے ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا انسان غاروں میں زندگی گزارتا تھا۔ پھر انسان نے شکار کی تلاش میں خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کی۔ پھر زراعت نے انھیں ایک جگہ ٹھہر کر بستیاں بنانے پر مجبور کیا۔ پھر یہ بستیاں بڑے بڑے شہروں میں تبدیل ہوگئیں۔ یہاں تک کہ اب انسان زمین سے نکل کر چاند پر بستیاں بنانے کی سوچ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سماج یا معاشرہ افراد کا محض سادہ سا مجموعہ نہیں بلکہ زندہ اور متحرک نظام ہے۔

سماجی ڈھانچے کے متعلق کئی نظریئے انسانی تاریخ سے الگ تھلگ کر کے محض خیالی منصوبے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ہم سماج کو تاریخ کے تعلق سے دیکھیں گے مگر پہلے اس کی چند خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ ہندو مذہب کے شارحین نے اس دنیا کو برہما کا خواب قرار دیا تھا۔ سماج اور اس کے افراد کی سرگرمیوں کو اس خواب کے کردار بتایا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ دنیا محض ہمارا وہم ہے۔ اس وقت نہ تو اتنی آبادی تھی نہ اتنی سرگرمیاں اس لیے لوگ اس کو سچ سمجھتے تھے۔ اس سے ملتے جلتے خیالات کئی دیگر مذاہب میں بھی موجود ہیں۔ یعنی یہ دنیا، یہ سماج، یہ لوگ سب خواب ہیں جو برہما کی آنکھ کھلنے سے کسی وقت بھی ختم ہو سکتے۔

اس طرح یونانی فلسفی افلاطون نے بھی آج سے تین ہزار سال قبل سماج اور اس دنیا کے متعلق اس سے ملتا جلتا تصور پیش کیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں عالم امثال ہے۔ یہ کوئی حقیقی دنیا نہیں ہے بلکہ کسی حقیقی دنیا کی پرچھائی ہے۔ اس کی مثال اس نے اس طرح دی کہ فرض کریں ایک غار میں کچھ لوگ کام کاج میں مصروف ہیں ان کے منہ دیوار کی طرف ہیں ان کے پیچھے آگ کا ایک الاؤ جل رہا ہے جس سے غار کی دیوار پر ان لوگوں کی حرکات وسکنات کی پرچھائی بنتی ہے۔ یہ پرچھائی ہمارا سماج ہے۔ مطلب یہ کہ ہم، ہمارا سماج اور یہ دنیا کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتی بلکہ یہ کسی حقیقی دنیا کی پرچھائی ہے۔ پھر جوں جوں قیاس پر مبنی انسانی علم مشاہدے سے اخذ کیے گئے علم میں بدلتا گیا تو ہمارے اردگرد کی یہ

Sanjh Lokraj

دنیا ایک حقیقی دنیا قرار پائی۔ پتا چلا کہ ہمارے ارد گرد جو کچھ موجود ہے وہ ایک مادی وجود رکھتا ہے۔ سماج بھی ایک مادی حقیقت ہے۔ مادی حقیقت کو اگر ہم تھوڑی تفصیل میں دیکھیں تو مادہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو وزن رکھتی ہے جگہ گھیرتی ہے اور ہمارے ذہن کے باہر اپنا آزاد وجود رکھتی ہے۔ آزاد وجود سے مراد ہے کہ اگر کوئی چیز ہماری نظر سے اوجھل ہو اور ہمارے ذہن میں اس کا تصور بھی نہ ہو تو بھی وہ چیز وجود رکھے۔

جیسے ہم کئی جزیروں کے بارے میں نہیں جانتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ایک دوسری طرح سے ذہن کے باہر آزاد وجود کو سمجھتے ہیں۔ ایک لفظ ہے خواہش۔ ظاہر ہے یہ بھی ہم نے کسی چیز کا نام خواہش رکھا ہوا ہے۔ دوسرا لفظ ہے ہوائی جہاز ظاہر ہے یہ بھی ہم نے کسی چیز کا نام رکھا ہوا ہے۔ خواہش اپنے وجود کے لیے کسی ذہن کی محتاج ہے، خواہش ہمارے ذہن کے باہر کوئی آزاد وجود نہیں رکھتی۔ ہاں ہوائی جہاز کا وجود ہمارے ذہن کے باہر ہے وہ جگہ گھیرتا ہے وزن رکھتا ہے اُسے چھو کر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہوائی جہاز ایک خارجی حقیقت ہے یعنی مادی وجود رکھتا ہے۔

سماج بھی ایک خارجی صداقت ہے۔ اس کا مادی وجود ہے۔ پھر اگر ہمارا ایمان ہے کہ آدم مٹی سے بنا ہے تو مٹی بھی تو مادہ ہی ہے۔ اگر انسان مادی وجود رکھتا ہے تو انسان ہی تو سماج کی اکائی ہے۔ تو سماج کی پہلی خصوصیت یہ ہوئی کہ سماج ایک مادی خارجی صداقت ہے۔ کوئی وہم و گمان نہیں۔

جب ہم سماج کو زندہ اور متحرک نظام کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سماج ایک مادی حقیقت ہے تو یہ سوال ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ سماج زندہ اور متحرک نظام کیسے ہے جبکہ سماج تو مادی ہے؟ اس سوال کے اُبھرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم بے جان چیزوں ہی کو مادی چیزیں سمجھتے ہیں اور جگہ بدلنے والی چیز کو متحرک خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے پھول جب پھل بنتا ہے تو یہ اس کے اندر ایک تبدیلی اور حرکت کا نام ہے۔ یا اگر کوئی یہ کہے کہ یہ جو ایک نئی اینٹ ہمارے سامنے پڑی ہے اس میں کیا متحرک ہے؟ تو آپ نے اپنے ارد گرد کئی مکان کھنڈر بنے دیکھے ہوں گے جو کہ کبھی نئی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ اب ان کی وہ شان و شوکت قائم نہیں رہی جو پہلے دن سے تھی تو اس کا مطلب ہے اینٹوں کے اندر تغیر و تبدیلی کا

Sanjh LokRaj

عمل جاری رہا جو ہمیں نظر نہیں آتا رہا۔ غیر محسوس طریقے سے جاری تبدیلی کا عمل بھی حرکت کہلاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز ہر لمحے غیر محسوس طریقے سے تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے خواہ وہ دھاتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح تبدیلی کے ایسے عمل کو جو غیر محسوس طریقے سے جاری رہتا ہے انھیں بھی متحرک ہونا کہتے ہیں۔ انسانی سماج بھی نہ صرف یہ کہ مادی خارجی صداقت ہے بلکہ متحرک نظام ہے۔ یہ سماج کی دوسری خصوصیت ہے۔ تو اب تک ہم سماج کی دو خصوصیات کو جان پائے ہیں۔ (1) اس کا مادی صداقت ہونا اور (2) ایک زندہ و متحرک نظام ہونا۔ اگر آپ انسان کو کسی خواب کا کردار یا پرچھائی نہیں سمجھتے تو پھر یہ بات سمجھنی کوئی مشکل نہیں کہ انسان کا سب سے پہلا فطری عمل زندگی کو جاری رکھنا ہے۔ پہلی سرگرمی بقائے زندگی کے لیے خوراک کی تلاش ہے۔ ویسے تو زندگی کا دارومدار اور کئی چیزوں پر بھی ہے جیسے سانس لینا۔ مگر ایسی چیز جو انسان کو فطرت اور دوسرے انسانوں سے جوڑتی ہے وہ ہے خوراک کا حصول اور زندگی گزارنے کے عمل میں پیداواری سرگرمیاں۔ انسان وہ تمام اشیاء پیدا کرتے ہیں جن کی انھیں زندہ رہنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے آلات و اوزار کو بہتر بناتے ہیں۔ اپنے مقررہ مقاصد حاصل کرتے ہیں، بہتر حالات زندگی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔

ابتداء میں تو انسان کو قدرت کے خزانوں سے سبھی کچھ مل جایا کرتا تھا۔ ایسے ملنے والی چیز کو نعمت کہا جاتا ہے۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور انسان کی ضروریات بڑھتی گئیں تو انسان کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی چیزیں خود پیدا کرنی پڑیں۔ وہ نعمت جو خود پیدا کرنی پڑی پیداوار کہلائی۔ نعمت کے پیداوار بننے کے عمل کو ہم ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ پانی بھی زندگی کی بقا کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ خوراک۔ شکار کے زمانے میں انسان دور دراز کا سفر طے کر کے پانی کے قدرتی سرچشموں سے اپنی پیاس بجھا لیتا تھا۔ زرعی دور میں تو خیر بستیاں ہی دریاؤں کے کنارے آباد کی گئیں تا کہ پانی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ لیکن جلد ہی انسان کو علم ہو گیا کہ جس زمین پر ہم رہ رہے ہیں اس کی سطح کے نیچے پانی ہے تو کنویں کھود کر پانی حاصل کرنے کا رواج ہوا۔ کنویں کی دریافت کے بعد بستیاں دریاؤں کے کناروں سے دور دراز بھی آباد ہونے لگیں۔ یہ کنویں دیہات کی پوری آبادی کی مشترکہ ملکیت بھی ہوتے تھے اور کہیں نجی ملکیت بھی۔ پھر ہینڈ پمپ ایجاد ہو گیا۔ ہر گھر میں نلکا لگ گیا۔ ہینڈ پمپ کا یہ پانی

Sanjh Lok Raj

انسانی محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔ صنعتی دور آیا تو زیر زمین پانی کھینچنے والی موٹر ایجاد ہوگئی۔ اب بٹن دبانے سے مشین نہ صرف پانی کو زمین کی سطح تک لے آتی ہے بلکہ سینکڑوں فٹ اونچی ٹینکی کو بھی بھر دیتی ہے۔ مگر آج؟ آج اگر آپ بازار جاتے ہیں تو وہاں مختلف سائز کی پیکنگ میں پانی کی بوتلیں دستیاب ہیں۔ بازار سے سودا لاتے ہوئے آپ پانی کی بوتلیں بھی خرید کر لاتے ہیں۔ یہ ہے پانی کا نعمت سے پیداوار اور پیداوار سے سودا بننے تک کا سفر۔ خوراک بھی اسی طرح نعمت سے پیداوار اور پیداوار سے سودا بن چکی ہے۔

پیداوار ہمارے خیالات پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ہم ایک مثال سے لگاتے ہیں۔ بھونڈ اور شہد کی مکھی دونوں میں سے کوئی ایک اگر انسان کو ڈنک مار لے تو کئی دن تک انسان کو تکلیف کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ نے بچپن میں یہ بھی سنا ہوگا کہ شہد کی مکھی کو مارنے سے گناہ ملتا ہے اور بھونڈ کو مارنے سے دو نفل کا ثواب۔ اگر ہم شہد کی مکھی اور بھونڈ کو مارنے سے متعلق گناہ اور ثواب کے خیالات کی مادی وجہ تلاش کریں تو پتہ چلتا ہے کہ شہد کی مکھی پیداواری صلاحیت رکھنے کی وجہ سے عزت کا مقام پا گئی۔ اور تخلیق رزق کی صلاحیتوں کے سبب مارکیٹ پر قابض ہوگئی۔ پیداوار ایک سماجی عمل ہے یا یوں کہیے کہ اجتماعی عمل ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک مغالطہ ہے مثلاً آپ روٹی ہی کو لیں۔ اجتماعی عمل سے مراد یہ نہیں کہ بہت سے لوگ مل کر ایک روٹی پکاتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روٹی چولھے پر پکنے سے پہلے گوندھا ہوا آٹا تھی۔ آٹا گوندھے جانے سے پہلے اور مشینوں سے گزرنے سے پہلے گندم تھا، گندم ایک پودا تھا جو بیج سے اگایا گیا۔ اس بیج کو ہمارے آباؤ اجداد ہزاروں سال سے سنبھالتے آئے ہیں۔ لہٰذا آپ کو ایک روٹی کے پیچھے محنت کرنے والوں کے ہزاروں ہاتھ نظر آئیں گے۔ اس طرح کپڑا جو آپ نے پہنا ہوا ہے اس کو زیب تن کرنے سے پہلے لاکھوں محنت کرنے والے ہاتھوں نے اسے یہ شکل دی ہے۔ اس لیے سماجی علم کے سائنسدانوں نے دریافت کیا ہے کہ پیداوار ہی ایک ایسا عمل ہے جو انسانوں کو آپس میں جوڑ کر سماج کی اس طرح تخلیق کرتا ہے جس طرح اینٹوں کو گارے یا سیمنٹ سے جوڑ کر عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ عربی زبان میں گندم کی روٹی کو عیشہ کہتے ہیں۔ لفظ معاشیات اسی سے نکلا ہے لیکن اب اس علم کے دائرہ میں پیداوار، ذرائع پیداوار، آلات پیداوار، تقسیم پیداوار اور پیداوار کے

Sanjh Lok Raj

تبادلے کے تمام مراحل اور ان پیداواری سرگرمیوں کا اداروں کی شکل اختیار کرنے تک کا تمام نظام ''معاشیات'' کہلاتا ہے۔

پیداوار ایک ایسی لازمی شے ہے جس کے بغیر کوئی بھی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ معاشرے میں پیداوار کی اہمیت اس حقیقت سے بالا ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کو صرف ضروریاتِ زندگی فراہم کرتی ہے بلکہ مادی اشیاء پیدا کرنے کے دوران انسان اپنی سماجی زندگی کا ڈھانچہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ سماجی ڈھانچہ حرکت پذیر اور تغیر پذیر رہتا ہے۔ مگر کیسے؟ اس بات کی وضاحت ہم تاریخ سے حاصل کریں گے۔

سماجی تشکیل:

انسانی سماج کی ابتداء سادہ سے پیداواری عمل سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسان شکار کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ اور ظاہر ہے شکار وہ یونہی خالی ہاتھ تو نہیں کیا کرتا ہوگا۔ اس کام کے لیے وہ مختلف قسم کے پتھروں کا استعمال کرتا۔ سال ہا سال کے مشاہدے سے اس نے سیکھ لیا تھا کہ بے ڈھب پتھر کی نسبت تیز دھار والا پتھر شکار پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ تیز دھار والے پتھر بھی اس کو اردگرد نعمت کے طور پر مل جایا کرتے تھے وہ انھیں چن چن کر جمع کر لیا کرتا تھا۔ لیکن جب کبھی ایسا ہوا کہ انسان نے اپنی ضروریات کے تحت کسی بے ڈھب کے پتھر کو تراش کر اس کو تیز دھار والا پتھر بنایا تو یہ آلہ انسان کی پہلی پیداوار اور پہلی تخلیق تھا۔ اس پیداواری عمل نے انسان کے دماغ میں نئے تخلیقی خیلات کو جنم دیا۔ یہی وہ ابتدائی تخلیقی خلیے تھے جس کی ترقی یافتہ شکل آج آپ کو راکٹ، خلائی سٹیشن اور کمپیوٹر وغیرہ کی تخلیق میں نظر آتی ہے۔ پہلے آلے کی تخلیق کے بعد انسان نے پتھر کا نیزہ اور بھالا بھی بنایا۔ نیزہ اور بھالا اس کے ہاتھ ہی کی نہیں دماغ کی توسیع بھی تھی۔

اس وقت انسان جو آلات استعمال کرتا تھا اس کی وجہ سے اس کا تنہا پیداوار کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ فطرت کے سامنے بے بس تھا۔ سادہ آلات کی وجہ سے اجتماعی محنت ضروری تھی۔ اس اجتماعی محنت نے لوگوں کو آپس میں جوڑ کر قبیلے اور برادری کی پہلی تشکیل کی۔ اس تشکیل کے بغیر انسان کی بقاء ممکن نہیں تھی۔ یہ شکاری قبائل شکار کی تلاش میں خانہ بدوشی کی

Sanjh Lok Raj

زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ نہ اس زمین کا کوئی اکیلا مالک تھا، جس پر شکار کیا جاتا، نہ اوزاروں کا کوئی مالک تھا اور نہ ہی پیداوار کا کوئی اکیلا مالک تھا۔ اس طرح فطرت اور انسانوں کے درمیان، انسانوں کے آپس کے درمیان جو تعلقات استوار ہوئے انھیں کسی فلسفیانہ اصطلاح میں باندھے بغیر سادہ الفاظ میں پیداواری تعلقات کہتے ہیں۔ یہ پیداواری تعلقات جوانسانوں کی برابری کی بنیاد پر قائم تھے ہزاروں سال قائم رہے۔ لیکن ان ہزاروں سال میں کئی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ لوگوں کو ایسے جانور بھی مل گئے جنھیں سدھایا جا سکتا تھا، پالا جاسکتا تھا، جن کی نسل بڑھائی جا سکتی تھی۔ جنگلی گائے بھینس کا شکار کرنا پڑتا تھا جبکہ پلی ہوئی گائے سال میں ایک بار بچہ بھی دیتی تھی۔ اس طرح گلہ بان قبیلے اون اور کھال کا استعمال بھی کرنے لگے۔ اس کے بعد گلہ بان قبیلے اور بربری قبیلے الگ الگ ہوگئے۔ یہ دنیا میں انسانی قبیلوں کی پہلی معاشی تقسیم تھی۔ آریائی قبیلے گلہ بان تھے جو ہندوستان میں آئے۔ زلزلوں کے دوران پہاڑوں سے لڑھکتے پتھروں کے مشاہدے نے قبائل کی زندگی میں تین بڑی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ایک تو پتھروں کی رگڑ کی وجہ سے آگ پیدا ہوئی جس کے بعد انسان نے تمام پتھروں کو رگڑ کر دیکھ لیا کہ صرف چقماق پتھر ہی کی رگڑ سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ آگ کے استعمال نے انسان کی زندگی یکسر بدل دی۔ اب انسان کے ذاتی استعمال کی چیزوں میں چقماق بھی شامل ہوگیا۔

دوسری تبدیلی جو انسانی سماج میں لڑھکتے پتھروں کے مشاہدے سے آئی وہ یہ تھی کہ انسان نے دیکھ لیا کہ گول پتھر زمین کی طرف تیزی سے آتے ہیں اور چوڑے پتھر کی رفتار کم ہوتی ہے۔ یہ مشاہدہ پہیہ کی ایجاد کا باعث بنا۔

تیسری تبدیلی جو پتھروں میں آگ لگ جانے اور اسی سے جنگل میں آگ پھیل جانے کی وجہ سے ہوئی اس سے جنگل کی راکھ میں کانسی اور دیگر دھاتوں کی دریافت ہوگئی۔ آگ اور دھات کے استعمال نے انسان کو ترقی دی برتن خیمے اور دھات کے اوزار بننے لگے۔ دستکاری شروع ہوئی جس سے قبیلوں کے اندر پیشے بڑھے یعنی معاشی تقسیم بڑھتی گئی۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ معاشی تقسیم در تقسیم یا طبقے وہ ہڈیاں بنتی ہیں جن سے سماج کا ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے۔

Sanjh Lokraj

غلام داری سماج:

گلہ بان قبیلوں نے پڑاؤ کے دوران دیکھ لیا کہ زمین پر گرنے والے بیج اُگ جاتے ہیں۔جس سے انسان نے زراعت سیکھی۔ زراعت کی وجہ سے انسان کو خانہ بدوشی چھوڑ کر مستقل سکونت اختیار کرنا پڑی۔ اب سماج کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دستکاری اور زراعت اپنی اپنی پیداوار کے تبادلے کی وجہ سے ترقی کرتی رہی۔ دستکاری اور زراعت کی پیداوار انفرادی ہوگئی۔ ذاتی ملکیت کا آغاز ہوا۔انفرادی محنت سے زائد پیداوار بھی ہوتی تھی۔ جو ایک قبیلے کی ضرورتوں سے بڑھ جاتی تو اس کی تجارت کی جاتی۔ اب تک چونکہ صرف انسانی محنت ہی پیداوار کا واحد ذریعہ تھی اس لیے چند طاقتور لوگوں نے کچھ انسانوں کو غلام بنا لیا۔ غلام اپنی محنت سے جو پیداوار کرتے تھے آقا اس پیداوار کا مالک ہوتا۔

قدیم دنیا کی پوری سماجی تنظیم اور ثقافت غلاموں کی محنت کے بل پر ہی پروان چڑھی۔ پہلے غلام داری سماج دریائے نیل، دریائے دجلہ وفرات۔ ہوانگ ہوا اور دریائے گنگا کے کنارے پیدا ہوئے اور غلام داری اپنی کلاسیکی شکل میں یونان،عرب، کارتھیج اور سلطنت روما میں قائم ہوئی۔غلام کی محنت آقاؤں کی آمدنی کا بنیادی ذریعہ تھی۔

عوام کی اکثریت سادہ جسمانی محنت میں مشغول رہتی ورمٹھی بھر لوگ پیداواری محنت سے آزاد ہو کر ذہنی مشاغل میں مصروف رہتے۔ مائتھالوجی اور فلسفہ کی بنیاد انہی لوگوں نے رکھی۔ معاشی تقسیم بڑھتی گئی۔ جتنے زیادہ پیشے ہوں اتنے ہی معاشی طبقات اور ثانوی طبقات وجود میں آتے ہیں۔ان کے مفادات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ان مفادات میں ٹکراؤ بھی ہوا ہے اور مفاہمت بھی۔سوال یہ ہے کہ یہ مفاہمت مختلف طبقوں کے درمیان تسلط اور اطاعت کے تعلقات میں کیسے ڈھالی گئی ہے؟ جواب ہے۔معاشرے کو ایک طبقے کی مرضی کے ماتحت رکھ کر۔

بس یہی ہوا، غلاموں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے نئے ادارے وجود میں آنے لگے۔ پہرے داروں اور پولیس کی ضرورت پیش آئی تا کہ غلام بھاگ نہ جائیں۔غلاموں سے کام لینے کے لیے منتظموں کی ضرورت تھی۔غلاموں کو غلام رکھنے اور اس نئی جائیداد (غلام) کو

Sanjh Lok Raj

دوسرے کی دست برد سے بچانے کے لیے قانون بنانے پڑے۔ پھر قانون نافذ کرنے کے لیے بھی تو کسی ادارے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ابتدائی شکل میں ادارے فوج، پولیس، نوکر شاہی، عدالتیں وغیرہ وجود میں آنے لگے۔

اس طرح ابتدائی ریاست کا وجود عمل میں آیا۔ آقا اور غلام کے تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیے نہ صرف ریاست بلکہ مذہبی پیشواؤں نے بھی کردار ادا کیا۔ اب پولیس، فوج، حکام، قانون و قواعد کا نظام ترتیب دیا گیا اور لوگوں پر ٹیکس لگائے گئے۔ ایسی ریاستیں جو غلام داری کے مرحلے پر وجود میں آئیں مسلسل جنگیں چھیڑتی رہتیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو غلام بنا کر ان کی محنت سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔

غلام داری کی معیشت نے جن پیداواری تعلقات کو جنم دیا ان کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑے۔ غلام داری کے سماجی تعلقات بھی ہزاروں سال رہے۔ یاد رہے کہ ہندوستان میں غلامی اتنے وسیع پیمانے پر رائج نہیں تھی جتنی عرب یونان اور سلطنت روما میں۔ یہاں قدیم اتماعی تعلقات کی واضح باقیات، قدیم پنچایتی خود کفیل دیہاتوں کے علاوہ مطلق العنان ریاستیں موجود تھیں جو سیاسی فرائض منصبی کے علاوہ معاشی امور بھی سرانجام دیتی تھی جیسے آب پاشی کی تعمیر اور اس کا انتظام و انصرام جس پر زراعت کا انحصار تھا۔ ہندوستان میں معاشرے کی ذات پات میں تقسیم نے انسانوں کے درمیان تعلقات کی ایک انوکھی نوعیت پیدا کر رکھی تھی۔ یہ ایک خاص قسم کی معاشرتی تنظیم تھی جو بے حد جامد تھی۔ جس میں تبدیلی اور ارتقاء کی صلاحیت انتہائی کم تھی۔ ذات پات ہی غلام داری کی ایک شکل تھی۔

جاگیرداری سماج:

جاگیرداری کی شروعات پر نظر ڈالی جائے تو یہ دو طرح سے رائج ہوئی۔ پہلی قسم کی جاگیرداری غلام داری سماج سے ارتقاء پذیر ہوئی۔ غلام داری سماج میں چونکہ انسانی محنت ہی پیداوار کا واحد ذریعہ تھی اور غلام کی حیثیت آلات پیداوار کی سی تھی۔ جنگیں غلاموں کی فراہمی کا خاص ذریعہ تھیں۔ اس لیے یونان و روما وغیرہ کی ریاستیں مسلسل جنگیں چھیڑتی رہتیں علاقوں کے علاقے تاراج کر کے مفتوحین کو غلام بنا لیتیں۔ اس لوٹ مار کی وجہ سے لوگ عدم تحفظ کا

Sanjh Lokraj

شکار رہتے اور ہر وقت ایک غیر یقینی صورتحال میں مبتلا رہتے۔

اب گاؤں صرف کاشتکاروں ہی کا نہیں رہ گیا تھا۔ اب یہ دستکار، موچی، جولاہا، لوہار، ترکھان اور معمار وغیرہ سبھی لوگوں کا تھا۔ وہ سردار جس کے پاس فوج تھی اسے یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنی فوجی طاقت کے سہارے اپنی برتری قائم کرے۔ دوسری طرف کسانوں اور دستکاروں کو اپنی پیداوار اور گھروں کی حفاظت کی ضرورت تھی تو انھوں نے فوجی سردار کی حفاظت میں آنا قبول کر لیا۔ اس طرح گاؤں کے انتظامات فیوڈل لارڈ کے پاس چلے گئے۔ فیوڈل لارڈ گاؤں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا۔ اس کی اپنی عدالت تھی۔ جہاں وہ لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرتا، جرائم پر سزا دیتا، ٹیکس عائد کرتا، قیمتوں کا تعین کرتا، ان کی سہولت کے لیے سڑکیں اور پل بنواتا اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کرتا۔ اس کے بدلے میں لوگ اس کی اطاعت کرتے اور اس کی خاطر فوجی خدمات سرانجام دیتے۔ اپنی زائد پیداوار اس کے حوالے کر دیتے تاکہ وہ اپنی حویلی، فوج اور ٹیکس اکٹھا کرنے والوں کے اخراجات پورے کر سکے۔ معاشرے میں آلات پیداوار میں ترقی کی وجہ سے غلام کی محنت غیر منافع بخش ہوتی گئی۔ غلاموں کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی کوئی ترغیب نہیں تھی۔ غلام داری مفلوج ہوگئی۔ محنت چونکہ ہر معاشرے کے وجود کی بنیادی شرط ہے اس لیے سماج کی ضرورتوں میں یہ تبدیلی آئی کہ ایسے تعلقات پیداوار قائم ہوں جس میں حقیقی پیداوار کرنے والے کو کام کی ترغیب مل سکے۔ یہ حل جاگیرداری سماج نے پیش کیا۔ کسان کو جاگیردار کی زمین کا جو حصہ استعمال کے لیے دیا جاتا وہ اس میں کی گئی پیداور کے ایک حصّے کا مالک ہوتا۔ اب تک زمین ہی پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ تھی اور گاؤں خود کفالت کو پہنچ چکے تھے۔ اپنے علاقے میں فیوڈل کا حق موروثی تھا۔

جاگیرداری کی دوسری قسم جو اوپر سے نافذ ہوئی وہ بادشاہت کے قیام کے ذریعے ہوئی۔ جب ایک طاقتور فیوڈل لارڈ فوجی طاقت کے بل بوتے پر اردگرد کی جاگیروں کو ہڑپ کر کے اپنے علاقے اور فوج بڑھاتا گیا تو یہ وسیع علاقے امپائر یا سلطنتیں کہلائے اور یہ فیوڈل لارڈ بادشاہ بن گیا۔ دنیا کے بڑے بڑے علاقوں پر سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ بادشاہ کا اتنے پھیلے ہوئے علاقے کو تن تنہا کنٹرول کرنا مشکل تھا اس لیے وہ ان علاقوں کو تقسیم کر کے اس کے

Sanjh Lokraj

انتظامات اپنے عہدے داروں فوجی سالاروں اور افسروں کو دے دیتا۔ علاقوں کی اس تقسیم کو بھی جاگیر کہا جاتا۔ بادشاہ کی طرف سے مقرر کردہ جاگیردار جاگیر کی آمدنی کے عوض فوجی خدمات دیتا اور خزانہ بھی بھرتا۔ زمین تاج کی ملکیت ہوتی او(Crown Land) کہلاتی یہ کسی جاگیردار کو بطور وراثت نہیں دی جاتی تھی۔

اس لیے جب کوئی نیا حکمران یا فاتح کسی سلطنت پر قبضہ کرتا تو ان فیوڈل لارڈز کو اپنی جگہ پر قائم رہنے دیتا جنھوں نے فاتح کے ساتھ تعاون کیا ہو۔ جن خاندانوں نے پرانے بادشاہ کا ساتھ دیا ہوتا ان کی جاگیریں چھین لی جاتیں اور فاتح انھیں اپنے وفاداروں میں تقسیم کر دیتا۔ عہد جاگیرداری میں معیشت زرعی پیداوار کے گرد گھومتی تھی مزارعے کھیتی باڑی کے ذریعے نہ صرف اپنا پیٹ پالتے بلکہ محنت کا بڑا حصّہ جاگیردار وڈیرے کو مختلف واجبات اور لگانوں کی صورت میں دے دیتے یہ لوگ زمین کے قیدی تھے نہ زمین چھوڑ کر کہیں جا سکتے تھے نہ پیشہ تبدیل کر سکتے تھے۔ مفت بیگار، جبری محصولات اور نذرانے ریاست کے نمائندوں کے حوالے کرنا پڑتے تھے۔ دستکاری بھی اپنے عروج پر تھی۔ خودکفیل دیہاتوں میں مال ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیدا کیا جاتا جبکہ جاگیرداری دور میں تجارت اور تبادلہ پیداوار کی وجہ سے فروخت کرنے کے لیے مال پیدا کیا جانے لگا۔ یہ تجارت آہستہ آہستہ بین الاقوامی ہوگئی جاگیرداری عہد میں بڑے بڑے شہر اُبھرے جو نہ صرف تجارتی مراکز بن گئے بلکہ مذہبی مراکز بھی تھے اور آرٹ، تعمیر، شعر و شاعری کے فروغ کا ذریعہ بھی بنے۔ سماجی ارتقاء کے لحاظ سے جاگیرداری دور غلامی کے دور سے ایک قدم آگے تھا۔ اس دور کے معروضی حالات نے بکھری ہوئی دنیا کو پہلے سے زیادہ متحد کیا۔ بڑی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں۔ حکومتوں اور بادشاہوں کو بے شمار وسائل میسر آ گئے۔ بادشاہ جس طرح چاہتے ان وسائل کو استعمال کرتے۔ چنانچہ کئی بادشاہوں نے ان وسائل کو منظّم طریقے سے سماجی ترقی کے لیے استعمال کیا۔ اگرچہ یہ سماجی ترقی عموماً ان حکمران طبقوں کے حصے میں ہی آئی۔ مگر دنیا نے مجموعی طور پر ترقی کی۔

سماجی ڈھانچہ:

پیداور کی وجہ سے انسان حیوانی دنیا سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اردگرد کے فطری حالات کے مطابق نہیں ڈھالتا بلکہ اردگرد کے حالات کو اپنی ضرورتوں کے

Sanjh LokRaj

مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح پیداوار انسانی سماج کے وجود کی بنیاد بن جاتی ہے اور پیداوار ہی وہ بنیاد ہے جس پر سماجی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے۔ لیکن سماجی ڈھانچے کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم پیداواری قوتوں کو سمجھیں کیونکہ آئندہ صفحات میں پیداواری قوتوں کا ذکر بار بار آئے گا۔

پیداوار محنت کا عمل ہے جس کا مقصد قدرتی وسائل کو انسانی ضرویات کے مطابق بنانا ہے۔ مثلاً درخت کی لکڑی کو ہم کھڑکیاں دروازوں کے علاوہ فرنیچر بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لوہے کو ٹریکٹر گاڑیاں اور فریج وغیرہ بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فطرت میں موجودہ چیزیں جن پر محنت کی جاتی ہے (تاکہ انھیں قابل استعمال بنایا جا سکے) انھیں اشیائے محنت کہتے ہیں اور انھیں خام مال بھی کہا جاتا ہے۔

ظاہر ہے خام مال کو تیار شدہ مال میں تبدیل کرنے کے لیے آلات و اوزار بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ جیسے لکڑی کاٹنے کے لیے کلہاڑی بھی استعمال کی جاتی ہے اور الیکٹرک آرا بھی اس لیے وہ اوزار جن کے ذریعے مطلوبہ پیداوار کی جاتی ہے انھیں آلات پیداور کہتے ہیں۔ تیسرا بذات خود محنت، محنت انسان کی ہر سرگرمی کو نہیں کہتے جیسے اخبار پڑھنا، کرکٹ کھیلنا بلکہ محنت انسان کی وہ سرگرمی ہے جس سے زندہ رہنے کے لیے اشیاء پیدا کی جائیں۔

اس طرح ''اشیائے محنت + آلات محنت + بذات خود محنت = پیداواری قوت'' کہلاتا ہے۔

انسان جو چیزیں استعمال کرتا ہے اس سے بھی پیدواری قوتوں کے ارتقاء کی سطح کا پتہ چلتا ہے انسان پیداواری قوتوں کی ترقی کی جس سطح پر ہو اس کے مطابق سماج میں معاشی طبقے ہوتے ہیں۔ ملکیت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ پیداوار کرنے والے، پیداوار کے مالک، پیداوار کا تبادلہ کرنے والے اور پیداور کو استعمال کرنے والے یہ سب گروہ اور طبقات وہ ہڈیاں ہیں جن سے سماجی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے۔

ملکیت اور محنت کی شکلوں کا طبقات ہونا اور ان طبقات کا سماج کے ڈھانچے کی ہڈیاں ہونا تو ڈھانچے کے ترکیبی اجزاء ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچے کی شکل دینے میں کیا عوامل کارفرما ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب سماجی سائنس کے بانیوں نے دیا

Sanjh Lok Raj

ہے وہ یہ کہ وہ عمل جس کی وجہ سے سماج کی ہڈیاں کسی مخصوص سماجی ڈھانچے کی شکل اختیار کرتی ہیں اس عمل کو پیدواری تعلقات یا پیدواری رشتے کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پیداواری تعلقات کیا ہیں؟

پیداواری عمل کے دوران انسان ایک دوسرے سے خاص تعلقات استوار کرتے ہیں۔ جیسے شکار کی زندگی میں اجتماعی محنت اور مل بانٹ کر کھانے سے برابری کے تعلقات استوار ہوئے۔ پھر غلام داری سماج میں غلاموں کی پیداوار اور غلام کے مالک کے ملکیتی تعلقات استوار ہوئے۔ مگر زرعی دور میں جاگیردار اور رعایا کے درمیان نیم غلامی کے تعلقات تھے رعایا اپنی پیداوار کے ایک حصّے کی مالک ہوتی تھی۔ اسی طرح صنعتی دور میں سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان ایک دوسری نوعیت کے تعلقات استوار ہوئے۔ جہاں ذرائع پیداوار کے مالک افراد ہوتے ہیں۔ چند لوگ ذرائع پیداوار کے مالک اور دوسرے ذرائع پیدوار سے محروم صرف محنت کرنے والے ہوں وہاں حاکمی اور محکومی کے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ان تعلقات کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں اور ان کا انحصار اس وقت کی پیداواری قوتوں پر ہوتا ہے جو سماج پر حاوی ہوں۔

پیداواری تعلقات ایسے خیالات ونظریات کو جنم دیتے ہیں اور ایسے قوانین کو پیدا کرتے ہیں جن سے معاشرے میں موجود طبقوں کی ایسی ترتیب لگ جاتی ہے جس کو ہم ڈھانچہ کہتے ہیں۔ یعنی اپنے اپنے وقت کی پیداواری قوتیں اور ان کے لازمی نتیجے میں پیدا ہونے والے پیدواری تعلقات ایسے خیالات و افکار کو جنم دیتے ہیں جو معاشرے کے مختلف طبقوں کو اس طرح ترتیب میں لاتے ہیں جن سے سماجی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ سماجی ڈھانچہ حرکت پذیر اور تغیر پذیر رہتا ہے کیونکہ سماج میں ایک وقت میں ماضی کے پیداواری تعلقات کی باقیات بھی ہوتی ہیں اور مستقبل کی پیداواری قوتوں کو جنم دینے والے پیداواری تعلقات بھی ہوتے ہیں۔

ہر نئی نسل کو پرانی نسل سے جو ذرائع ورثہ میں ملتے ہیں وہ مزید ترقی کا نقطہ آغاز بن جاتے ہیں۔ یہی تاریخ کے تسلسل کی بنیاد ہے۔ پیداواری تعلقات ہمیشہ خارجی مادی تعلقات ہوتے ہیں۔ ان کا انحصار انسان کی خواہش پر نہیں ہوتا نہ ہی انھیں کسی اخلاقی ضابطے

Sanjh Lok Raj

یا وعظ ونصیحت سے بدلا جا سکتا ہے۔ پیداواری قوتوں میں ہونے والی تبدیلی ہی پیداواری تعلقات کو بدل سکتی ہے۔

ریاستی نظام:

جس طرح ڈھانچہ پورا جسم نہیں ہوتا اسی طرح سماجی ڈھانچہ بھی پورا سماج نہیں ہوتا۔ معاشرتی تشکیل کا دوسرا مرحلہ جسے ہم گوشت پوست کہتے ہیں وہ اس کا ریاستی نظام ہے۔ ریاستی نظام ایک ظاہری شکل یا اوپری یعنی بالائی ڈھانچہ بھی کہلاتا ہے۔ سماج کا ریاستی نظام ان رابطوں، خیالوں اور اداروں کا مجموعہ ہے جو پیداواری تعلقات کی بنیاد پر جنم لیتے ہیں۔ پیداواری تعلقات جن سیاسی، قانونی، مذہبی خیالات، فلسفیانہ نظریات، اخلاق اور اخلاقی قدروں، فنون اور جمالیاتی تصورات کو جنم دیتے ہیں وقت کے ساتھ یہ سب خیالات اداروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو ان کا مادی اظہار ہوتے ہیں۔ یہ ادارے مل کر ریاستی نظام کو جنم دیتے ہیں۔ جس طرح جاگیرداری پیداواری قوتوں اور پیداواری تعلقات نے بادشاہت کو جنم دیا اور سرمایہ داری کے تعلقات پیداوار نے جمہوریت کو جنم دیا۔

سرمایہ داری سماج:

سماج کے آگے بڑھتے رہنے کا عمل پیداواری قوتوں کی ترقی اور اس کے نتیجے میں تشکیل پانے والے پیداواری تعلقات پر منحصر ہے۔ دستکاری کی پیداوار اگرچہ جاگیرداری کے شباب کے زمانے میں عروج کو پہنچ گئی تھی لیکن بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھی کیونکہ اس میں پیداوار بڑھانے کی صلاحیت محدود تھی۔ منڈی کی ضرورتوں نے نئی قوت کو جنم دیا۔ یہ قوت تھی باہمی تعاون اور کارخانہ داری۔ لوگوں کو اکٹھا کرنے سے محنت کی بارآوری بڑھی۔ اگرچہ دستکاری ہی کے اوزار کارخانہ داری کی تکنیکی بنیاد تھے۔ اس پر پیداواری عمل کو حصّوں میں بانٹ دینے سے محنت کی بارآوری میں اضافہ ہوا۔ اب انسانی عوامل کو مشین کے عوامل میں بدلنے کے لیے لازمی شرائط پیدا ہوئیں۔ کارخانہ داری کی اس ترقی نے مشینی پیداوار کی راہ ہموار کی۔

نوآبادیوں سے لوٹی ہوئی دولت نے یورپ میں صنعتی انقلاب برپا کر دیا۔ ان صنعتی

Sanjh Lok Raj

ملکوں میں پہلے سے موجود جاگیردارانہ ریاستی نظام، درجوں کے مطابق مراعات کا سلسلہ مطلق العنان بادشاہت یہ سب پیداواری قوتوں کی مزید ترقی کی ضرورتوں کے متضاد تھے۔ مشینی پیداوار نے دو نئے طبقوں کو جنم دیا جنھیں صنعت کار اور مزدور کہتے ہیں۔ ابتدا میں صنعت کار کو اپنی مشینیں چلانے کے لیے مزدور کی ضرورت تھی۔ مگر کسان جاگیردار کی مرضی کے بغیر گاؤں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ کسان کو نیم غلامی سے نجات حاصل کرنا تھی۔ لہٰذا انسانی حقوق کی تحریکوں نے جنم لیا۔ جس سے فالتو کسانوں نے شہروں کا رخ کیا وہاں وہ سرمایہ داروں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ نئی پیداواری قوتوں سے نہ صرف ایک کارخانے کے اندر بلکہ پیداوار کی مختلف شاخوں میں محنت کی وسیع تقسیم کے سبب ایسے پیداواری رابطے قائم ہوئے جو پوری قومی معیشت کو ایک لڑی میں پرو کر ایک مربوط نظام میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس طرح پیداوار کی مختلف اقسام کا ایک دوسرے پر دارومدار ہوتا ہے۔ ان سرمایہ داری پیداواری تعلقات کی بنیاد پر معاشرے میں پیدا ہونے والے عام خیالات، تصورات، جذبات، جب ادارہ جاتی شکل اختیار کرتے ہیں اور ایک ریاستی نظام میں ڈھلتے ہیں تو انھیں سرمایہ دارانہ جمہوریت کہتے ہیں۔

اتنی طویل بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیداواری قوتیں لازمی طور پر مخصوص پیداواری تعلقات کو جنم دیتی ہیں یہ پیداواری تعلقات بنیاد بنتے ہیں ہمارے خیالات، تصورات، جذبات، سیاست، قانون، اخلاق وغیرہ کی۔ یہ خیالات و تصورات مادی شکل اختیار کر کے ادارے بن جاتے ہیں۔ یہ ادارے ریاستی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ یعنی سماجی ڈھانچہ جس طرح کا ہوگا ویسا ہی اس معاشرے کا ریاستی نظام ہوگا۔ یہ سب کچھ جاننے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سماج، اس کے تصورات و خیالات، اداروں اور ریاستی نظام سمیت سماج کے کسی بھی مظہر کی مادی تشریح کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور اس قابلیت کے حاصل کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہم سماج کو تبدیل کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

ریاستی نظام ماضی کی باقیات پیداواری تعلقات مستقبل کے رجحانات

ادارہ جاتی تشکیل (سماجی ڈھانچہ) سماج سماج پیداواری قوتیں

اخلاق واخلاقی قدریں تعلیمی نظریات فنون جمالیات تصورات

سیاست قانون مذہبی خیالات فلسفیانہ نظریات

khalid\smaji dhancha\ryasti
nazam.jpg not found.

Sanjh Lok Raj

جاگیرداری پیداواری تعلقات اور کالونیل ریاستی نظام

سماجی سائنس کے بانیوں نے تاریخ کے مطالعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ سماجی ڈھانچہ ہی کسی معاشرے کے ریاستی نظام کو پیدا کرتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ پیداواری قوتوں کی آزاد نشوونما ہو۔ پوری دنیا میں پیداواری قوتوں کی آزادنشوونما کا دور کالونیل دور آنے تک رہا مگر جب سرمایہ دارملکوں نے نئے علاقوں پر قبضہ کیا تو وہاں نوآبادیاتی سلطنتیں قائم کیں اور تمام دنیا کو سرمایہ دارانہ ارتقاء کی لپیٹ میں لے آئے تو ان ممالک کی پیداواری قوتوں کی نشوونما روک کر انھیں سامراجی معاشیات کے تابع کر دیا۔ ان پر ایسا کالونیل ریاستی ڈھانچہ مسلط کیا جس کے اداروں نے مقبوضہ ملکوں کے عوام کو تاریکی اور پسماندگی کے دلدل میں پھنسا کر انھیں معاشی غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ پاکستان جیسے پوسٹ کالونیل ملک کی معاشیات، سیاست، آئین، قانون، ریاستی اداروں، تعلیم اور دیگر معاشرتی مظاہر کا تجزیہ ان کی بنیادوں میں موجود کالونیل اثرات کو جاننے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

سولہویں اور سترہویں صدی کا ہندوستان دیہات اور شہروں میں تقسیم تھا۔ اس کی 90 فیصد سے زیادہ آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی۔ دیہاتی آبادی کا گزارہ زراعت پر تھا۔ فصل کی کاشت لوہے کے پھالے والے لکڑی کے ہل اور بیلوں کی جوڑی سے کی جاتی تھی۔ آبپاشی کے ذرائع محدود تھے۔ فصل کی پیداوار کا انحصار موسم اور بارش پر تھا۔ جاگیرداری عہد میں پوری دنیا کی معیشت زراعت ہی کے گرد گھومتی تھی۔ اور پوری دنیا ہی میں زرعی پیداوار کا انحصار قدرت کے رحم و کرم پر ہی تھا۔ یعنی ہر زرعی معاشرہ اپنی اپنی پیداوار کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق اپنے اپنے خدا کی مرضی پر منحصر تھا۔ اس لیے زرعی معاشرے میں جو کچھ بھی پیدا ہوتا تھا خواہ وہ اس کا

Sanjh Lok Raj

سماجی ڈھانچہ ہو یا ریاستی نظام، ایسا مانا جاتا تھا کہ یہ سبھی خدا ہی نے ایسا بنایا ہے۔

جاگیرداری عہد کی زرعی پیداوار نے ایک طرف پیداوار کے فوری عمل کے نتیجے میں جاگیر کے مالک اور کسان کے درمیان ''مالک اور مزارع'' کا تعلق پیدا کیا جسے سیاسی حقوق کے حوالے سے جاگیردار اور رعایا کا نام دیا جاتا ہے۔ تو دوسری طرف زرعی پیداوار کے قدرت پر انحصار نے جاگیرداری پیداوری تعلقات کی بنیاد میں مذہب کو لازمی عنصر کے طور پر شامل کر دیا۔

اس طرح جاگیرداری پیداواری تعلقات پر قائم ہونے والے بادشاہت کے نظام کو دنیا کے تمام مذاہب نے خدا کی طرف سے اپنی مخلوق کے لیے پسند کیا گیا نظام قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ وہ پنڈت تھے، چرچ تھا یا علمائے دین سب نے بادشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ قرار دیا۔

جاگیرداری پیداواری تعلقات کو سمجھنے کے لیے یہ بات اہم ہے کہ بادشاہ کا زمین پر خدا کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت رعایا پر اسی طرح فرض تھی جیسے مخلوق پر اپنے خدا کی۔ بادشاہ کی ذات قانون اور انصاف کا منبع تصور کی جاتی تھی۔ خدا کی ذات کی طرح بادشاہ اور اس کے سارے ریاستی نظام پر تنقید کا سوچنا بھی گناہ تھا۔ بادشاہ کے کسی ظالمانہ حکم سے رعایا کا نقصان بھی ہو جاتا تب بھی وہ اس میں اپنی ہی کوئی بھلائی تلاش کرتے رہتے تھے۔

بادشاہت چلانے کے لیے ایک بڑی تعداد منصب داروں کی تھی۔ منصب داروں کے علاوہ لاکھوں سرکاری ملازمین تھے۔ جو محلات خزانے، فوج، عدالت کے علاوہ بعض دوسرے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ بڑے جاگیردار، وزراء، بخشی، قاضی اور دوسرے اعلیٰ عہدیداروں کا شمار بھی امراء میں ہوتا تھا۔ مگر حکومت کی تمام طاقت صرف ایک ہی شخص میں مرکوز تھی۔ اس کے برعکس رعایا بدترین حالات میں زندگی گزارتی تھی۔ کسان جو کچھ پیدا کرتے اس میں مقامی جاگیرداروں، مذہبی پیشواؤں اور بادشاہ کے خزانے بھرتے۔ گاؤں کی آبادی دوہری رعایا تھی۔ پہلی مقامی جاگیردار کی دوسرے بادشاہ کی۔ یہی پیداواری تعلقات جو زراعت کے زمانے میں جاگیردار اور رعایا کے درمیان موجود تھے وہی تعلقات زندگی کے دوسرے شعبوں پر حاوی تھے جیسے استاد اور شاگرد، پیر اور مرید، باپ اور اولاد وغیرہ کے درمیان۔

جاگیرداری پیداواری تعلقات اور پیداوار کے قدرت پر انحصار سے جو خیالات و نظریات جنم لیتے ہیں ان کی بنیادی پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کا نمونہ

Sanjh Lok Raj

ہوتے ہیں۔ اس میں سیاست، قانون، فلسفیانہ نظریات، اخلاق اور اخلاقی قدریں، فنون حتیٰ کہ جمالیاتی تصورات کا منبع بھی مذہب ہوتا ہے۔ جاگیرداری پیداواری تعلقات سے پیدا ہونے والے نظریات زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اپنے اپنے مذہب کو مضبوط کرنے کے لیے دلائل فراہم کرتے ہیں۔ جس طرح ریاستی نظام کا وجود اور بقا بادشاہ کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح سے کائنات کا نظام خدا کے بغیر ممکن نہیں۔

جاگیرداری پیداواری تعلقات کی دوسری بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ہر کائناتی اور معاشرتی مظہر کی تشریح مذہب کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ لوگ اپنے حالات کو، خوشی غمی پیداوار میں کمی یا اضافہ، بیماری وصحت، غلامی اور آزادی، تعلیم و جہالت، خوشحالی یا بدحالی کو خدا کی مرضی سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اپنے حالات میں بہتری کے لیے کسی منصوبہ بندی کی بجائے خدا کی مرضی کو اپنے حق میں بدلنے کے مختلف حربے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

اگرچہ بادشاہ کو خدا کی طرف سے مقرر کردہ سمجھا جاتا تھا لیکن پھر بھی اگر کوئی بیرونی بادشاہ حملہ کر کے بادشاہ کو قتل کر دیتا اور اس کی سلطنت پر قبضہ کر لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ سے خدا ناراض ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی جگہ نیا بادشاہ آ گیا ہے۔ لہٰذا مغلیہ سلطنت ختم کر کے انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو اسے بھی خدا کی مرضی سمجھا گیا۔ پاکستان کو بھی مملکتِ خداداد پاکستان کہا جاتا ہے۔ تاکہ اس میں موجود کالونیل ریاستی اداروں کے کردار اور لوگوں پر ہونے والے ظلم وستم کے ذمہ داروں سے توجہ ہٹائی جا سکے۔

جاگیرداری پیداواری تعلقات کی تیسری بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ہر ریاستی نظام خواہ وہ جمہوریت ہو یا آمریت اور ان کے ذریعے آنے والا حکمران خواہ غاصب ہو یا منتخب، خدا ہی کی مرضی سے آیا ہوا سمجھا جاتا ہے۔

ویسے تو جاگیرداری پیداواری تعلقات سے پیدا ہونے والے خیالات لاتعداد ہیں مگر ہمیں پاکستان کے سماج کا تجزیہ کرتے وقت جس خصوصیت سے واسطہ پڑے گا وہ ہے موروثیت یعنی حاکم کا بیٹا حاکم اور غلام کا بیٹا غلام۔ ترکھان کے گھر ترکھان پیدا ہوگا اور لوہار کے لوہار۔

آج دو ہزار گیارہ میں اگر پتہ چلانا ہو کہ جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اس میں جن خیالات کی کارفرمائی ہے وہ کن پیداواری تعلقات کی عکاسی کرتے ہیں تو یہ ہم

Sanjh Lok Raj

لوگوں کی گفتگو سے پتا چلا سکتے ہیں کیونکہ زبان ان خیالات کا لباس ہوتی ہے جو ہمارے ذہن میں موجود ہوں۔ جیسے آپ نے سنا ہوگا۔

''یااللہ بجلی آ جائے'' یا ''یااللہ کوئی ایسا حکمران بھیج جو ہمارے ملک کی تقدیر سنوار دے'' یہ تو ہیں پاکستان کے حالات۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی لوگ ووٹ نہرو خاندان کے وارثوں کو دیتے ہیں اور اچھے حکمران کے لیے التجا بھگوان سے کرتے ہیں۔

سولہویں اور سترہویں صدی کے ہندوستان کے شہروں میں گھریلو دستکاری بڑے پیمانے پر رائج تھی۔ دستکاری کی کارخانہ داری عروج پر تھی۔ مغلیہ حکومت خود کارخانے قائم کرتی اور چلاتی تھی۔ شہر دیہاتوں کی نسبت خوشحال تھے۔ آگرہ، فتح پور اور لاہور شہر اُس وقت لندن سے بڑے تھے۔ کپڑے کی صنعت ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت تھی۔ یورپ کے امیر طبقوں کے عیش و آرام کا سامان ان دنوں ہندوستان سے جاتا تھا۔ ان کے لیے ہیرے، جواہرات، زیورات، قالین، ریشم، چینی کے برتن، شیشے کا سامان، عطریات ہندوستان سے جاتے تھے۔ اس تجارت میں نفع بھی بہت تھا جس سے یورپ کے تاجر امیر ہو گئے تھے۔ یورپ کے فیوڈل حکمران ان تاجروں کی دولت کی وجہ سے ان کا اثر ورسوخ اور دباؤ بھی قبول کرتے تھے۔

سترہویں صدی کے شروع میں برصغیر ایک ایسا ترقی پذیر دستکاروں کا علاقہ تھا جہاں پرانی جاگیرداری تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ اس وقت تک یہاں جاگیردارانہ نظام نے معاشی اور سماجی ترقی کا عمل نہیں روکا تھا۔

چونکہ دوسرے ملکوں سے درآمدات کی مقدار بہت کم تھی اس لیے تجارت کا توازن ہندوستان کے حق میں تھا۔ یورپی عوام شکایت کرتے تھے کہ ان کے حکمران طبقے ہندوستان کا بنا ہوا مال تعیش استعمال کرتے ہیں اس لیے ان کی دولت ہندوستان چلی جاتی ہے۔ آج بھی یہ اصول ہے کہ جس ملک کی برآمدات زیادہ ہوں گی وہ ملک ساری دنیا سے دولت اکٹھی کر کے اپنے ملک میں لائے گا جس کا نتیجہ خوشحالی ہوگا۔ اس کے برعکس جس ملک کی درآمدات زیادہ ہوں گی۔ اس ملک کی دولت دوسرے ممالک میں جائے گی اور وہ غریب اور بدحال ہوگا۔

یورپ میں سرمایہ داری کی جانب عبور خود بخود بیرونی دباؤ کے بغیر شروع ہوا۔ سرمایہ داری کا ارتقاء، اٹلی میں تجارتی شہروں کی ترقی، پرتگالی اور ہسپانوی بحر نوردوں کی عظیم جغرافیائی

دریافتیں، نوآبادیوں سے لوٹی ہوئی دولت، برطانیہ اور فرانس کے انقلابات اور نئی پیداوری قوتوں کی ترقی، جس کا تعلق مشینی پیداوار سے تھا سرمایہ دارانہ ارتقاء کا سرچشمہ و بنیاد تھی۔

سرمایہ داری پیداوار کو اجتماعی بنا دیتی ہے کیونکہ سرمایہ دار کے کارخانے کی پیداوار اصل میں ہزاروں لاکھوں مزدوروں کی اجتماعی پیداوار ہوتی ہے۔ یہاں پر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ پیداوار صرف اسی کی ہے۔

صرف ایک کارخانے کے اندر ہی نہیں بلکہ پیداوار کی مختلف شاخوں میں محنت کی وسیع تقسیم کے سبب ایسے پیداواری رابطے قائم ہو جاتے ہیں جو پوری معیشت کو ایک لڑی میں پرو کر ایک مربوط نظام میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس طرح پیداوار کی مختلف اقسام کا ایک دوسرے پر دارومدار ہوتا ہے۔ اس پیداوری عمل میں جو پیداوری تعلقات قائم ہوتے ہیں انھیں سرمایہ دارانہ پیداواری تعلقات کہتے ہیں۔ ان پیداواری تعلقات پر جو خیالات ونظریات، سیاست و قانون وغیرہ قائم ہوتے ہیں ان کی بنیادی خصوصیت، قدرت پر انحصار نہیں ہوتا بلکہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے سیکھ کر قدرت پر قادر ہونے کا احساس ہونا ہے۔ بادشاہ کی جگہ تمام لوگوں کی مرضی سے بنایا گیا مربوط سیاسی نظام تشکیل دینا، خیالات و مذہبی عقائد پر ہر انسان کا حق تسلیم کرنا، مادی اخلاق اور جمالیات کی تشکیل کرنا۔ اس طرح ان خیالات ونظریات نے جب اداروں کی شکل اختیار کی تو ایک مربوط ریاستی نظام وجود میں آیا۔ عدلیہ، انتظامیہ، پارلیمنٹ، آئین، بجٹ، بنیادی انسانی حقوق وغیرہ۔ اس مربوط نظام کو سرمایہ دارانہ جمہوریت کا نام دیا گیا۔ خود کار مشینوں، توانائی پیدا کرنے پر انسانی اختیار، اپنی مرضی کی پیداوار لینے پر انسان کی دسترس، بیماریوں پر فتح حاصل کرنے میں کامیابیاں اور قدرت پر قادر ہونے کے بڑھتے ہوئے احساس نے سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ کلچر کو پیدا کیا۔ قدرت پر قادر ہونے کے احساس نے انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنے سماجی مسائل بھی حل کرنے پر دسترس رکھتا ہے۔ اس نے بے زبان انسانوں کو زبان دی۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے گفتگو کرنے لگے۔ بحث ومباحثے برپا ہونے لگے۔ کسی شے کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے اور اندھی حاکمیت کے سامنے بے حیل وحجت سر جھکانے کی بجائے اپنے حقوق اور نمائندگی حاصل کرنے کے لیے منظّم ہو کر جدوجہد کرنے لگے۔ انسانی غلامی، اونچ نیچ کے متعلق تمام مروّجہ مذہبی نظریات کو عقل و دانش کی

Sanjh Lok Raj

کسوٹی پر پرکھنے لگے، حتیٰ کہ انسان نے اپنے تجربے سے سیکھ کر دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کی ارادی جدوجہد شروع کر دی۔

جب جاگیردارانہ تعلقات پیداوار نے اپنی جگہ سرمایہ دارانہ تعلقات پیداوار کو دی تو ان کا ریاستی نظام بھی بدل گیا۔ جس کو نئی بنیاد کے مطابق ہونا لازمی تھا۔ اس طرح پورے معاشرے کا حلیہ بدل گیا۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداور کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے تمام پہلو بھی اس کی ضرورت کے لحاظ سے اس کے مطابق ہو گئے۔ اب بادشاہ کی جگہ قانون کی حکمرانی نے لے لی۔ سب کے لیے برابر مواقع، سماجی انصاف، شخصی آزادی، برداشت کی قدریں معاشرے پر حاوی ہوئیں۔ اب کائنات کے سارے نظام کو بھی ایک مربوط خود کار مشین کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ ان مماک کی حد تک ہے جن ممالک میں سرمایہ دارانہ معیشت بغیر کسی رکاوٹ کے ارتقا پذیر ہوئی۔ ایسا ان ممالک میں ہوا جہاں پیداواری قوتوں کی آزادنشو ونما ہوئی سرمایہ داری میں پیداوار کا محرک منافع ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کی ضروریات یا ان کی قوت خرید سے زیادہ پیداوار کی جاتی ہے۔ منافع کمانے کی غرض سے سرمایہ داری بیرونی توسیع بھی اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ سرمایہ دار ملکوں نے مقبوضہ علاقوں یا نوآبادیوں میں پیداوار کی مخصوص شکلیں محفوظ رکھیں۔ ان ممالک کی ترقی یافتہ ملکوں کے لیے خام مال پیدا کرنے والے اور اپنی تیار کی ہوئی مصنوعات کی منڈی بنا لیا۔ اس طرح سرمایہ داری نے پہلے عالمی سالم نظام کی بنیاد رکھی۔ عالمی منڈی پیدا کی۔ اس منزل پر آ کر تاریخ پورے معنوں میں عالمی ہوگئی۔ کیونکہ اب مختلف علاقوں اور قوموں کی ایک دوسرے سے علیحدگی ختم ہوگئی تھی آج ہم کسی بھی قوم کے حالات دنیا سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر تک برصغیر میں ایسی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں جو برطانیہ کے معاشی تقاضوں کی مطابقت میں تھیں۔ پرانے جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور نوابوں کے حکمران طبقے کا انگریزوں کے ہاتھوں صفایا ہو چکا تھا۔ دستکاری کی صنعت کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ پیداوار محض زرعی رہ گئی تھی۔ ایک ہی پیداوری طبقہ کسانوں کا طبقہ رہ گیا تھا اس مرحلہ پر انگریزوں نے کالونیل جاگیرداری متعارف کروائی۔ جس کا مقصد ہندوستان کی معیشت کو زراعت پر جامد رکھنا اور پیداواری قوتوں کی آزادنشوونما کو روکنا تھا۔ اس طرح جاگیرداری

Sanjh Lokraj

پیداواری تعلقات رکھنے والے معاشرے پر کالونیل ریاستی نظام مسلط کر دیا گیا۔ ابتدائی مرحلے پر انگریزوں کو اپنے ملک میں بڑھتی ہوئی صنعتوں کے لیے خام مال کی ضرورت تھی لیکن اگلے مرحلے پر انیسویں صدی کے وسط میں یورپی ممالک میں تیزی سے صنعتی ترقی ہو رہی تھی۔ ان ممالک میں برطانیہ کی مصنوعات کی کھپت کم سے کم ہوتی جا رہی تھی انگلستان میں صنعتی سرمایہ داری نظام بہت ترقی کر چکا تھا اور سرمایہ کی بہتات ہو رہی تھی انفرادی سرمایہ کا آپس میں مقابلہ سخت ہو رہا تھا۔ سرمایہ کی برآمد کی ضرورت تھی اور بیرونی سرمایہ کاری کے لیے ضروری تھا کہ مقبوضہ ممالک میں ''امن و امان'' قائم رہے۔ برصغیر میں کالونیل معیشت کا قیام ان مجبوریوں کے تحت عمل میں لایا گیا۔ اور کالونیل پیداواری تعلقات پیدا کیے گئے۔

کالونیل پیداواری تعلقات دراصل جاگیرداری پیداواری تعلقات کو ریاستی اداروں کے جبر سے قائم رکھنے کا نام ہے۔ پیداواری قوتوں کی آزادنشوونما کو روک کر انھیں سامراجی معاشیات کے تابع کرنے کا نام ہے۔ غلامی سے مفاہمت اور سمجھوتہ کرنے کا نام ہے۔ اس کام کے لیے کالونیل جاگیرداری متعارف کروا کر تھانہ، پٹوار سے لے کر اعلیٰ بیوروکریسی، فوج اور عدلیہ تک کو اس کی حفاظت کا منصب سونپا گیا۔

پاکستان کو چونکہ پورا ریاستی نظام کالونیل ورثہ کے طور پر ملا ہے اس لیے ہم پاکستان میں تمام سماجی مظاہر خواہ وہ معاشی حالات ہوں یا سیاسی نظام، بنیاد پرستی ہو یا غیر پیداواری نظام تعلیم، بیوروکریسی، فوج اور عدلیہ کا اتحاد ہو یا سیاسی پارٹیاں، آئین ہو یا بجٹ، مارشل لاء ہو یا جاگیرداری جمہوریت۔ اور معاشرے کے آگے بڑھنے کی رفتار کو بھی جاگیرداری پیداوری تعلقات اور کالونیل ریاستی نظام کے تعلق کی نظر سے دیکھیں گے۔ اور کالونیل معاشی نظام کے محافظ اداروں اور جاگیراری پر جامد کرنے والے کالونیل معاشی مفادات کے محافظ طبقوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

Sanjh Lokraj

فوج
بیوروکریسی + عدلیہ
کالونیل جاگیرداری
کالونیل
معاشی ڈھانچہ
کالونیل انتظامی ڈھانچہ

Sanjh Lok Raj

بیوروکریسی

بیورو کا لفظی مطلب ہے محکمہ یا ڈیپارٹمنٹ، کریسی کا مطلب ہے راج یعنی سرکاری محکموں کا راج۔ محکمے جیسا کہ محکمہ پولیس، محکمہ ریونیو، محکمہ واپڈا، محکمہ صحت، محکمہ تعلیم، محکمہ دفاع وغیرہ۔ محکمہ کوئی غائبی چیز نہیں ہوتا بلکہ یہ مجموعہ ہوتا ہے ان لوگوں کا جنھیں ہم افسر کہتے ہیں۔ ان افسروں کو نہ تو عوام نے چنا ہوتا ہے اور نہ ہی یہ عوام کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ یہ صرف اپنے سے اوپر والے افسر کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ اس طرح محکمے میں اوپر جاتے جاتے صرف ایک افسر رہ جاتا ہے جسے سیکرٹری کہتے ہیں۔ ہر محکمے کا سربراہ ایک سیکرٹری ہوتا ہے پھر تمام سیکرٹری مل کر ایک چیف سیکرٹری کے ماتحت ہوتے ہیں۔ یہاں تک یہ سول بیوروکریسی کہلاتی ہے۔

جن ممالک میں آئین کی حکمرانی ہو، اختیارات کا تعین ہو اور الیکشن کے ذریعے حکومت منتخب کی جاتی ہو۔ وہاں ہر محکمے کا ایک وزیر ہوتا ہے۔ جتنے محکمے ہوں اتنے ہی وزیر۔ تمام محکموں کے وزیر مل کر کابینہ کہلاتے ہیں۔ صوبائی کابینہ کا سربراہ وزیراعلیٰ اور وفاقی کابینہ کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ پٹواری اور تھانیدار سے لے کر وزیراعظم تک کو ریاست کا انتظامی ڈھانچہ کہتے ہیں۔ اور اِسی انتظامی ڈھانچے ہی کو حکومت کہا جاتا ہے۔ حکومت جدید ریاست کے تین برابر اور متوازی اداروں میں سے ایک ادارہ ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جدید ریاست صنعتی معیشت کی ضرورتوں کی پیداوار ہے۔ مقبوضہ ممالک یا کالونیوں سے لوٹی ہوئی دولت نے جب یورپ کے ممالک میں صنعتی انقلاب برپا کر دیا تو وہاں زرعی معیشت کے محافظ ادارے جاگیرداری، معاشرتی اور سیاسی زندگی پر چرچ کا عمل دخل اور اس کا سیاسی ڈھانچہ بادشاہت آہستہ آہستہ ختم ہوتے چلے

Sanjh Lok Raj

گئے اور صنعتی معیشت کے محافظ ادارے ان کی جگہ لیتے چلے گئے۔ ان اداروں ہی کو جدید ریاست کے ادارے کہتے ہیں۔ یہ ادارے قانون ساز اسمبلیاں، عدلیہ اور انتظامیہ ہیں۔ جدید ریاست میں فوج حکومت کا ایک محکمہ ہوتی ہے جسے محکمہ دفاع کہا جاتا ہے۔

جیسے پاکستان میں بھی ایک وزیر دفاع ہوتا ہے۔ جدید ریاست کے سٹرکچر میں عدلیہ ایک ادارہ ہے۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ جدید ریاست کے ادارے ہوتے ہیں اور حکومت کے محکمے۔ اداروں اور محکموں کے درمیان فرق مالک اور نوکر کا ہوتا ہے۔

لیکن کیا پاکستان ایک جدید ریاست ہے؟ پاکستان میں بیوروکریسی کے کردار اور اس کی ساخت کو سمجھنے کے لیے اس سوال کا جواب ضروری ہے کیونکہ بیوروکریسی کے کردار کا تعلق ریاست کی نوعیت سے ہے۔ مطالعہ پاکستان کی درسی کتابوں سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ 14 اگست 1947ء کو پاکستان عدم سے وجود میں آ گیا تھا اور وجود میں آتے ہی جدید ریاست بھی بن گیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو پوسٹ کالونیل ریاست کے طور پر وجود میں آیا۔

پوسٹ کالونیل کو سمجھنے کے لیے ہمیں پاکستان میں بیوروکریسی کی ساخت اور کردار کو برطانوی سامراج کے ہندوستان پر قبضے یعنی کالونیل دور کے مختلف مراحل کے پس منظر میں سمجھنا ہوگا۔

ہندوستان میں سول بیوروکریسی کا پہلا دور 1741ء میں جنگ پلاسی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی لین دین کا حساب رکھنے والوں کو انتظامی اختیارات سونپنے سے ہوا 1757ء میں انگریزوں نے بنگال بہار اور اوڑیسہ پر قبضہ کر لیا تو مغل بادشاہ کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی دیوانی کے اختیارات مل گئے۔ یہ بیوروکریسی کا دوسرا دور تھا۔ جو ریکوری آفیسر مقرر کیے گئے وہ مختلف قسم کے ٹیکس اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مقدمات بھی نمٹاتے تھے۔ اس طرح انھیں لوگوں کی ذاتی زندگی پر دسترس حاصل ہوگئی۔ ان افسروں کو کلکٹر کہا جاتا تھا۔ ان افسروں کے کردار کے متعلق برطانوی پارلیمنٹ میں کیسی تقریریں ہوتی تھیں اس کا ایک نمونہ 1783ء میں ایڈمنڈ برک کے خطاب سے ہوتا ہے۔

''ہندوستان کے لیے یہ لیٹروں کا لامتناہی سلسلہ چیلوں اور گدھوں کے غولوں کی

Sanjh Lok Raj

طرح ہے جو ایسے مردہ شکار کے لیے آ رہے ہیں جس کا گوشت پوست ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا شکار انگلستان آ جاتا ہے اور ہندوستان کی آہ و بکا، نالہ و فریاد اس برساتی نالے کی طرح ہے جو سمندر میں جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا تم یقین کرو گے کہ ہمارے ان جواں سال ملازمین کا رویہ بادشاہوں کی طرح ہے۔ اگرچہ ان کے عہدوں کے نام سپروائزر، کلکٹر اور جج وغیرہ ہیں لیکن عملاً یہ جابر بادشاہ ہیں۔''

ہندوستان پر ان جابر بادشاہوں کا راج 1857ء تک رہا۔ 1857ء سے بیوروکریسی کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ 1830ء تک برطانیہ میں صنعتی انقلاب کا ابتدائی مرحلہ مکمل ہو چکا تھا۔ یہ نیا معاشی نظام پرانے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچوں میں نہیں چل سکتا تھا۔ نئے معاشی نظام کو نئے معاشرتی و سیاسی ڈھانچے کی ضرورت تھی۔ برطانیہ میں ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے نے اپنے سرمائے کے تحفظ کے لیے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسمبلیوں کے اختیارات بڑھتے چلے جا رہے تھے اور بادشاہ کی سیاسی طاقت کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو انگلستان کے بادشاہ جیمز اوّل کی طرف سے ہندوستان سے تجارت کا دوامی اجارہ ملا ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی مصنوعات برطانیہ کی منڈی میں سستے داموں فروخت کرتی تھی جس کی وجہ سے ہندوستانی مصنوعات کا برطانوی مصنوعات سے مقابلہ ہو جاتا تھا۔ برطانوی صنعت کو ڈر تھا کہ ہندوستان کی سستی مصنوعات کی وجہ سے ان کی صنعت اپنی ابتداء ہی میں دم نہ توڑ جائے۔ اس طرح برطانوی صنعتی سرمایہ داروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی سرمایہ داروں کے مفادات شروع ہی سے ٹکرا رہے تھے۔ برطانیہ کا صنعت کار طبقہ 1720ء ہی سے ہندوستانی کپڑے کی برطانوی منڈی میں فروخت پر پابندی لگوا کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف کامیابیاں حاصل کرنے کا آغاز کر چکا تھا۔ جیسے جیسے برطانوی پارلیمنٹ بادشاہ کے خلاف کامیابیاں حاصل کرتی جا رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات کو محدود کرتے جا رہے تھے۔ یہ لڑائی آخر کار 1857ء میں ہندوستان پر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو ختم کر کے حکومت برطانیہ کے براہِ راست قبضے پر منتج ہوئی۔ 1857ء تک برطانوی صنعت کار اپنا اقتدار مستحکم کر چکا تھا۔ 1857ء

Sanjh Lok Raj

کے بعد برطانوی پالیسی یہ رہی ہے کہ نہ صرف ہندوستان کو برطانیہ میں قائم صنعتوں کے لیے خام مال پیدا کرنے والے خطے کے طور پر ترقی دی جائے بلکہ اسے برطانوی مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈی بھی بنا دیا جائے۔ مزید یہ کہ کچھ علاقوں کو پسماندہ رکھ کر غربت کے مارے کسانوں میں سے انگریزی فوج کے لیے افرادی قوت حاصل کی جائے۔ اس پالیسی کو کالونیل مفادات کہا جاتا ہے۔1857ء کے بعد ہندوستان پر مسلط کی جانے والی بیوروکریسی کی پیدائش ان کالونیل مفادات کے محافظ ادارے کے طور پر ہوئی۔ امریکہ کی جنگ آزادی کے ہارنے کے بعد ہی سے برطانوی سامراج نے تہیہ کر لیا ہوا تھا کہ کسی کالونی میں صنعتی انقلاب نہیں آنے دیا جائے گا۔ ان کالونیوں کو ہمیشہ زراعت پر جامد رکھا جائے گا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے چار سطحی بیوروکریٹک ڈھانچہ مسلط کیا گیا۔

1۔ وائس رائے/ گورنر جنرل

2۔ صوبوں کے گورنر/ لیفٹننٹ گورنر

3۔ کمشنر

4۔ کلکٹر/ مجسٹریٹ

اس بیوروکریسی کے مفادات کے لیے محکمہ قانون بنایا گیا۔ یاد رہے کہ پاکستان میں عدلیہ کا قیام ریاست کے ادارے کے طور پر نہیں ہوا بلکہ 1857ء کے بعد کالونیل حکومت کے ایک محکمے کے طور پر ہوا۔ یہاں تک کہ 15 فروری 2010ء کو پاکستان کے وزیراعظم سیّد یوسف رضا گیلانی نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو یاد ہونا چاہیے کہ سپریم کورٹ اور دیگر اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی بحالی ایک ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے ہوئی ہے۔ جس کی توثیق پارلیمنٹ سے ہونا ابھی باقی ہے۔ لیکن اس بیان سے ان کا مقصد پارلیمنٹ سے توثیق کروانا نہیں تھا۔ بلکہ چیف جسٹس اور دیگر ججوں کو یہ بتانا تھا کہ یہ ایگزیکٹو آرڈر اگر واپس لے لیا جائے تو تمام جج نوکری سے فارغ ہو جائیں گے۔ پاکستان کی عدلیہ نے تو ابھی محکمہ سے ادارہ بننے کا آغاز کیا ہے۔

پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ دانشور حمزہ علوی کا کہنا ہے کہ سامراجیوں نے فوج کے ذریعے علاقوں پر قبضہ کیا اور سول بیوروکریسی کے ذریعے ان علاقوں کے لوگوں کی

Sanjh Lok Raj

معاشی و معاشرتی زندگی کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔ اسی وجہ سے سامراجیوں نے اپنی تمام کالونیوں میں فوج اور سول بیوروکریسی کے دو محکموں کو ضرورت سے کہیں زیادہ طاقتور بنایا۔

قبضے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قبضے کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ جب تک وہاں کے مقامی لوگوں کے ایک گروپ کو حاصل ہونے والے مفادات میں شراکت دار نہ بنا لیا جائے۔ اس کے لیے برطانوی سامراج نے ایک کالونیل جاگیردار طبقہ پیدا کیا۔ ہندوستان پر برطانوی سامراج نے فوج، بیوروکریسی اور جاگیرداروں کے ذریعے 1857ء سے 1947ء تک راج کیا۔ یہ ایک کالونیل ریاست تھی جس کا مقصد مقامی لوگوں کی معاشی و معاشرتی زندگی کو سامراجی مفادات کے تابع ڈھالنا تھا۔ اس دوران 1919ء سے تو بیوروکریسی کا کام امن وامان کے قیام کے پرفریب نام پر آزادی مانگنے والوں پر گولیاں برسا کر یا انھیں جیلوں میں بند کر کے خاموش کرنا تھا۔ 1935ء کے آئین کے نفاذ کے بعد صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں تو مرکزی حکومت کی گرفت صوبوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔ 1947ء میں پاکستان قائم ہوا تو اسے برطانوی سامراج سے ورثہ میں کیا ملا۔

1۔ برٹش انڈین آرمی کا وہ حصہ جو مسلمان جرنیلوں پر مشتمل تھا۔ جنھوں نے انگریزوں کے حکم کی تعمیل میں خانہ کعبہ پر گولیاں برسا کر اسے ترکی سے آزاد کروایا تھا۔

2۔ کالونیل بیوروکریسی جس کی پیدائش ہی کالونیل معاشی مفادات کے محافظ ادارے کے طور پر ہوئی تھی۔

3۔ کالونیل جاگیردار طبقہ جو ہندوستان کو زراعت پر جامد رکھ کے اسے برطانوی مصنوعات کی منڈی بنائے رکھنے کے لیے قائم کیا تھا۔

4۔ جاگیرداری کی محافظ پولیس اور پولیس کی ضمنی کو آسمانی صحیفہ سمجھ کر فیصلہ کرنے والی عدالتیں۔ یعنی انتظامیہ کے ماتحت عدالتیں۔

5۔ کالونیل بیوروکریسی کے پسندیدہ چنے ہوئے جاگیرداروں پر مشتمل صوبائی حکومتیں

ان پانچوں اجزاء کو مادی حالات کہتے ہیں۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو پاکستان کی مرکزی حکومت نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ کالونیل ریاست میں کوئی ادارہ موجود نہیں تھا صرف محکمے تھے۔ کالونیل ورثہ کے طور

SanjhLokRaj

پر ملے ہوئے ان اجزاء سے پاکستان کی مرکزی حکومت تشکیل دی جانی تھی۔ ریاستی مشینری کا لفظ تو اب ہر شخص نے سنا ہوا ہے۔ ذرا اس پر غور کرنے کے بعد ہم دوبارہ مرکزی حکومت کی طرف آتے ہیں۔

مختلف قسم کی مشینریاں مختلف قسم کی چیزیں پیدا کرتی ہیں۔ کپڑا بنانے والی مشین بجلی کا بلب پیدا نہیں کر سکتی اور بجلی کا بلب پیدا کرنے والی مشینری کپڑا نہیں بنا سکتی۔ کیونکہ کپڑا بنانے والے مشینری کے پرزے ہی الگ ہوتے ہیں اور انھیں جوڑ کر ایسی ساخت بنائی جاتی ہے کہ وہ کپڑا پیدا کرے۔ ریاستی مشینری کے پرزے اس کے ادارے اور محکمے ہوتے ہیں۔ پاکستان کو جو محکمے کالونیل ورثہ کے طور پر ملے جن کا کردار ہندوستان کی معاشی ترقی کو کالونیل مفادات کے تابع رکھنا تھا۔ ان اجزاء کو ملا کر جو مرکزی حکومت تشکیل دی گئی اس کو پوسٹ کالونیل ریاست کہتے ہیں۔ قائداعظم نے نئی حکومت میں گورنر جنرل کی حیثیت سے بیوروکریسی کے سربراہ کے طور پر حلف اُٹھا لیا۔ اس پوسٹ کالونیل ریاست میں ایک آئین ساز اسمبلی بھی موجود تھی۔ مگر قانون آزادی ہند 1947ء کی دفعہ 9 کے تحت آئین سازی کا اختیار ایک سال کے لیے گورنر جنرل کو دیا گیا تھا۔ اس دفعہ کے تحت جولائی 1948ء میں گورنر جنرل کے ایک حکم کے ذریعے 1935ء کے آئین میں ترمیم کر کے آرٹیکل 92-A کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس کے ذریعے گورنر جنرل نے صوبائی حکومتوں کو برطرف کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ ان اختیارات کو بیوروکریسی استعمال کرتی تھی اور آئین ساز اسمبلی کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

ہندو اور سکھ جو جائیدادیں اور کاروبار چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے ان کی تقسیم بھی اس بیوروکریسی کے ذمہ تھی جس کی وجہ سے بیوروکریٹوں کے خاندان بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک بن گئے مگر جاگیرداروں کو اس میں اپنا حصہ لینے کے لیے بیوروکریٹس کی چاپلوسی کرنی پڑی۔

1950ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کے گروپ نے پہلا پنج سالہ منصوبہ تشکیل دیا۔ جس کا مقصد پاکستانی معیشت کو عالمی سرمایہ داری کے مفادات کے تابع تعمیر کرنا تھا۔ اس منصوبے کے تحت 1952ء سے سرکاری سرپرستی میں پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن نے کام شروع کر دیا اس کی سربراہی ایک سینیئر بیوروکریٹ غلام فاروق کے حصہ میں آئی۔ وہ بھی جلد

Sanjh Lok Raj

ہی ملک کا سب سے بڑا صنعت کار بن گیا۔ اس طرح 1952ء تک بیوروکریٹوں نے کسی کو خاطر میں لائے بغیر پاکستان پر راج کیا۔

1947ء سے 1954ء تک کا دور پاکستان میں محکموں کی تشکیل اور مرکزی حکومت کا قیام عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ 1945ء کے بعد تمام سرمایہ دار ممالک امریکہ کی سربراہی میں عالمی سرمایہ داری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نئے عالمی سامراج کے سامنے دنیا میں سب سے بڑا خطرہ سوشلسٹ بلاک تھا۔ اگر پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کا اقتدار بیوروکریسی کی بجائے سیاستدانوں کو منتقل ہوتا اور وہ ایسی معیشت کا انتخاب کرتے جس کے ذریعے یہ ملک معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا تو اسے لازمی طور پر سوشلسٹ بلاک کی طرف جانا پڑتا۔ مگر ہماری مرکزی حکومت کالونیل ورثہ کے جن اجزاء سے ملکر بنی تھی، جن کی پیدائش کا مقصد ہی مقامی لوگوں کی معاشی ترقی کو سامراجی مفادات کے تابع رکھنا تھا، انھوں نے نئے سرے سے کالونیل دور میں طاقتور بنائے گئے محکموں کو اس طرح ترتیب دیا کہ ایک بیوروکریٹک الائنس بن گیا۔

قائداعظم اس دوران علیل تھے اور ان کے اختیارات بیوروکریسی استعمال کرتی تھی۔ 1948ء میں ان کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنا دیا۔ جو کہ اتنے بے اثر تھے کہ بیوروکریسی فیصلہ کرتے وقت ان سے مشورہ کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا۔ اصولی طور پر ان کی جگہ نئے وزیراعظم کا انتخاب آئین ساز اسمبلی میں سے ہونا تھا۔ مگر اس وقت کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کا عہدہ گھٹا کر انھیں وزیراعظم بنا دیا گیا اور ایک بیوروکریٹ ملک غلام محمد کو گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ دوبارہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس دوران ایک آئین ساز اسمبلی بھی موجود تھی جس کو کبھی خاطر میں نہیں لایا گیا۔ کیونکہ کالونیل دور میں بھی سیاسی فیصلوں کا اختیار برطانوی حکومت نے ان بیوروکریٹس کو دیا ہوا تھا۔ اب پاکستان کے تمام معاشی وسائل اور سیاسی فیصلوں کے مالک بیوروکریٹس بن گئے۔ وہ اس صورتحال اور اپنے قبضے کو اسی صورت میں قائم رکھ سکتے تھے کہ ملک میں آئین نہ بننے دیا جائے۔

کیونکہ آئین ان کے اختیارات کو منتخب نمائندوں کے تابع کر دیتا۔ گورنر جنرل کے

Sanjh Lok Raj

عہدے کو ابتدائی دو تین سالوں میں انتہائی طاقتور بنا کر بیوروکریسی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ مگر لوگوں کی توقعات آئین سازی کے لیے آئین ساز اسمبلی پر لگی ہوئی تھیں اور یہ اسمبلی بیوروکریٹس کی آنکھ میں کھٹکتی تھی۔ 1953ء میں خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے سیاسی حکومت کے خلاف تحریک چلوائی گئی۔ جس کے نتیجے میں بیوروکریٹ گورنر جنرل غلام محمد نے سیاستدان وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا اور امریکہ میں پاکستانی سفیر غلام محمد بوگرہ کو وطن بلا کر اسے وزیراعظم نامزد کر دیا۔ اکتوبر 1954ء میں پہلی آئین ساز اسمبلی کو برطرف کر دیا گیا۔ اس برطرفی کے بعد جنرل ایوب خان کو وردی سمیت ہی کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ جسٹس منیر نے آئین ساز اسمبلی کی برطرفی کو گورنر جنرل کا آئینی حق قرار دے کر سول، فوجی اور عدالتی بیوروکریسی کی تکون کو مکمل کر دیا۔ اس تکون کے پاکستان پر قبضے کے ساتھ ہی 1954ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدے کر لیے اور پاکستان نیو کالونیل ریاست کے طور پر امریکہ کا اتحادی بن گیا۔

کالونیل دور میں سرمایہ دار ممالک اپنی کالونیوں پر براہ راست قبضہ رکھ کر کالونیوں کی معاشی ترقی کو اپنے تابع مفاد رکھتے تھے مگر نیو کالونیل دور میں انھوں نے کالونیوں کو بظاہر آزاد کر دیا تھا مگر یہاں کی بیوروکریسی، فوج اور کالونیل جاگیردار طبقے کو اقتدار میں رکھا تاکہ اپنے مقامی پٹھوؤں کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کر لے۔ اس لیے ان ممالک میں ان سیاسی قوتوں کو بڑی بے دردی سے کچلا جاتا رہا ہے جو عوام کی معاشی حالت سدھارنے کی بات کرتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں کو غیر منظّم رکھ کر منظّم فوج کے ذریعے مارشل لاء لگوایا جاتا رہا۔

اسے نیو کالونیل ازم کہتے ہیں آپ کے کئی وزیراعظم اور کئی وزیرخزانہ ورلڈ بنک کی مرضی سے بنائے جاتے ہیں۔ یعنی پہلے برطانیہ وائس رائے مقرر کرتا تھا۔ اب آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک آپ کو وائسرائے بھیجتا ہے۔

پاکستان میں فوجی، سول اور عدالتی بیوروکریسی کا اتحاد 9 مارچ 2007ء تک قائم رہا۔ اس اتحاد کا مقصد تھا:

1۔ پاکستان کی معیشت کو عالمی سرمایہ داری نظام کے تابع رکھنا۔

2۔ جاگیرداروں کو مضبوط رکھ کر ان کا سیاسی اثر ورسوخ قائم رکھنا تاکہ ملک صنعتی ترقی

Sanjh Lok Raj

نہ کرے۔ پولیس کے ذریعے لوگوں کو مجبور رکھنا کہ وہ جاگیرداروں کی پناہ میں رہیں تاکہ بوقت ضرورت ان جاگیرداروں کو بیوروکریسی کی مرضی کی حکومت بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

3۔ فوج کو نصاب تعلیم اور میڈیا کے ذریعے اس قدر مقدس بنا کر پیش کرنا کہ کوئی پاکستانی جو اپنے وسائل سے کئی گنا زیادہ دفاعی بجٹ اور امریکہ سے دفاعی معاہدوں کو تنقید کا نشانہ بنائے وہ غدار کہلانے کا مستحق ہو اور فوج کی سیاست میں مداخلت کے خلاف سوچنے والا خود کو گنہگار سمجھے۔

4۔ آئین نہ بننے دیا جائے اور اگر آئین بن بھی جائے تو آئین کی بالادستی قائم نہ ہونے دی جائے۔

5۔ نظام تعلیم کو سائنسی تحقیق کی بجائے بنیاد پرستی پر قائم کیا جائے۔ تاکہ لوگ اپنے بنیادی انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد کی بجائے اپنے اپنے عقیدے کو ایک دوسرے پر مسلط کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کرتے چلے جائیں۔

6۔ جمہوریت اور سوشلزم کو کفر قرار دیا جائے۔

پاکستان کی بیوروکریسی آج بھی نیو کالونیل معاشیات کے مفادات کا محافظ ادارہ ہے۔ اور آج بھی پالیسیوں پر وزیر کی بجائے سیکرٹری کے دستخط ہوتے ہیں۔ ان مادی حالات میں پاکستان میں ہونے والے کئی عوام دشمن فیصلوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

Sanjh Lok Raj

فوج

یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ برطانوی سامراج نے ہندوستان کو ہندوستانی وسائل اور ہندوستانی فوج ہی کے ذریعے فتح کیا تھا۔مگر یہ فوج تھی کیا؟

یہ قحط زدہ اور جاگیرداری کی وجہ سے پسماندہ رکھے گئے علاقوں کے بھوکے کسان تھے۔ یہ جاگیرداروں کی وہ رعایا تھے جو مالک کے حکم کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جاگیردار کے لیے بیگار کرتے اور معاوضے کی بجائے فصل پر مالک کی سخاوت کی وجہ سے کچھ غلہ حاصل کر پاتے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ اگر گھر میں مویشی پالتے تو بھی جاگیردار کو ٹیکس ادا کرتے۔انھیں برٹش انڈین آرمی میں بھرتی ہونے کے لیے سب سے بڑی کشش اس بات میں تھی کہ ہر مہینے کے آخر میں انھیں تنخواہ مل جاتی تھی۔اس تنخواہ کے بدلے میں وہ برٹش سامراج کا ہر حکم ماننے کو تیار تھے۔ان میں سے اگر کوئی بہت زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہوتا اور برطانوی فوج سے اس کی وفاداری شک و شبہ سے بالاتر ہوتی تو اسے رسالدار میجر یا صوبیدار میجر کے اعزازی عہدوں تک ترقی دے دی جاتی۔لیکن پھر بھی ان کے ہم عہدہ برطانوی افسروں کے سامنے ان کی حیثیت غلام ہی کی رہتی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران1918ء میں جنگی ضرورتوں، آزادی مانگنے والوں کے دباؤ اور ہندوستانیوں میں پڑھے لکھے نوجوانوں میں بیروزگاری کی وجہ سے بےچینی کو کم کرنے کے لیے رائل کمیشن قائم کیا گیا اور پورے ہندوستان سے ہر سال برٹش انڈین آرمی میں 10 افسر بھرتی کرنے کی اجازت دی گئی۔ان دس نوجوانوں کی گورنر یا وائسرائے بھرتی کے لیے سفارش کرتا۔رائل ملٹری کالج سینڈ ہرسٹ میں ان کی تربیت کی جاتی اور برٹش انڈین آرمی میں

Sanjh Lok Raj

خدمات کے لیے واپس ہندوستان بھیج دیا جاتا۔

1917ء میں روس میں سوشلسٹ انقلاب کے بعد ہندوستان میں آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا تو1924ء میں برطانوی حکومت نے آزادی مانگنے والوں کو تب تک آزادی کے انتظار کا مشورہ دیا جب تک کہ برٹش انڈین آرمی کی پوری کمانڈ ہندوستانی افسروں کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔

1928ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان سے بھرتی کیے جانے والے افسروں کا کوٹہ بڑھا کر20 کر دیا۔

دوسری جنگ عظیم تک برٹش انڈین آرمی کی انڈیانائزیشن کا عمل بہت سست رہا اور ان کی صف بندی بیرونی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے سے زیادہ اندرونی انتشار (Internal Security) کو کچلنے کی بنیاد پر کی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز ہی میں برطانیہ کو ہندوستانی افسروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لیے عارضی کمیشن قائم کیا گیا۔ یکم اکتوبر1939ء کو برٹش انڈین آرمی میں ہندوستانی افسروں کی تعداد396 تھی اور برطانوی افسر4028 تھے عارضی کمیشن کے ذریعے ہندوستانی افسروں کی تعداد بڑھا کر8500 اور برطانوی افسروں کی تعداد13500 کر دی گئی۔ جنگ کے خاتمے پر عارضی افسروں کو گھروں کو بھیج دیا گیا۔ اس طرح تقسیم ہند کے وقت برٹش انڈین آرمی میں کل ہندوستانی افسروں کی تعداد2600 رہ گئی۔

جون1947ء میں ان ہندوستانی افسروں سے پوچھا گیا کہ وہ تقسیم ہونے والے برطانوی ہند کے کس حصے کے لیے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتے ہیں تو کل 200 مسلمان افسروں نے پاکستان کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن پاکستان آزاد ہوا تو اس کے حصے میں کل500 فوجی افسر آئے جن میں300 افسر برطانوی تھے۔ مسلمان افسروں میں کوئی بھی کرنل کے عہدے سے زیادہ کا نہیں تھا۔ لہٰذا کمانڈر انچیف برطانوی افسر جنرل گریسی کو بنا دیا گیا۔

سول بیوروکریسی جو پاکستان کے حصے میں آئی اسے برطانوی دور میں سیاسی فیصلوں کے تابع عمل کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ بیوروکریسی خود فیصلے کرتی تھی۔ اور سیاستدان اِس پر عملدرآمد کراتے۔ کیونکہ پاکستان کے حصے میں آنے والے زیادہ تر

Sanjh Lok Raj

سیاستدان وہ تھے جو برطانوی سامراج کے پیدا کردہ جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔15 اگست1947ء کو پاکستان ایک سابقہ کالونی تھا۔کالونی یا مقبوضہ ملک میں ریاست کے ادارے نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی بلکہ چند کالونیل محکمے تھے جن میں محکمہ دفاع بھی موجود تھا۔ جو سول بیوروکریسی کے سیکرٹری دفاع کے تحت کام کرتا تھا۔ جنرل سکندر مرزا جو سینڈھرسٹ کا تعلیم یافتہ تھا پاکستان کا پہلا سیکرٹری دفاع مقرر ہوا۔

پاکستان تاریخ کے اس مرحلے پر وجود میں آیا جب دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں برطانیہ کی کمر ٹوٹ گئی ہوئی تھی اور اب وہ ہندوستان پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یورپ کے تمام سامراجی ملکوں کی کالونیوں سے لوٹی ہوئی دولت کا زیادہ تر حصہ اسلحہ کی خریداری میں امریکہ منتقل ہو چکا تھا۔تمام سامراجی ممالک امریکہ کی سربراہی میں عالمی سرمایہ داری نظام کی طرف بڑھ رہے تھے۔کالونیوں کو اس ڈھنگ سے آزاد کیا جا رہا تھا کہ قبضے کے دوران پروان چڑھایا گیا معاشی نظام اس طرح محفوظ رہے کہ سابقہ کالونیاں زراعت پر جامد رہیں جاگیرداری مضبوط رہے اور سابقہ کالونیوں میں سیاسی قوت رہے۔ نظام تعلیم بیوروکریسی کے کنٹرول میں رہے تاکہ سابقہ کالونیاں صنعتی ترقی کی راہ پر چل کر معاشی طور پر اپنے پاؤں پر نہ کھڑی ہوسکیں۔اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی منڈی رہیں۔کالونیل دور میں جبر واستحصال کے لیے پروان چڑھائے گئے محکمے عوامی طاقت سے ہمیشہ زیادہ طاقتور رہیں۔بس انگریزوں کو ہٹا کر سارے کا سارا کالونیل سسٹم مقامی لوگوں کے سپرد کرنے کا نام آزادی تھا۔

دوسری طرف سوشلسٹ بلاک تھا جس کا سربراہ روس تھا۔ دنیا دو واضح معاشی بلاکوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ روسی فوجوں کی جرمنی کے خلاف پیش قدمی کے نتیجے میں قائم ہونے والی سوشلسٹ ریاستوں کو بھی دیکھ چکا تھا۔ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے عالمی سرمایہ داری کے معاشی مفادات کو صرف روس کی طرف سے خطرہ تھا۔

اپنے موضوع کی طرف آنے سے پہلے ہم چند الفاظ میں امریکہ اور روس کے درمیان لڑائی کی ساری وجوہات کا جائزہ لیں گے۔لیکن یہ ساری وجوہات اپنا اظہار نظریات کی شکل میں اس طرح کر چکی تھیں کہ یہ لڑائی سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان تھی۔ سرمایہ داری سے مطلب ہے دولت پیدا کرنے والے رزق کے قدرتی اور مصنوعی وسیلوں پر مٹھی بھر

افراد کی ملکیت کو قائم رکھنا۔ اور سوشلزم کا مطلب ہے دولت پیدا کرنے والے رزق کے قدرتی اور مصنوعی وسیلوں پر مجموعی آبادی کی ملکیت ماننا۔ امریکہ اور روس کے معاشی نظاموں کے درمیان لڑائی یہ تھی کہ امریکہ کروڑوں لوگوں کو بھوکا جاہل بے روزگار، علاج اور رہائش کی سہولتوں سے محروم رکھنے کی قیمت پر مٹھی بھر لوگوں کو رزق اور اقتدار پر قابض رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے سرمایہ داری نظام نے دنیا پر فتح پانے کے لیے دو راستے اپنائے ایک فوجی طاقت کا استعمال دوسرے بنیاد پرستی کی ترویج کے ذریعے حقوق سے محروم لوگوں کو ذہنی پسماندگی میں رکھنا۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اپنے موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔

اب پاکستان کے اقتدار پر قابض لوگوں نے معاشی ترقی کا جو راستہ چُنا تھا پاکستان کے حالات کو اُسی رخ پر چلنا تھا۔ کسی ملک کی معاشی ترقی کا راستہ ہی اُس ملک کے سیاسی اداروں کی شکل کا تعین کرتا ہے۔ تقسیم کے وقت پاکستان کو اثاثوں کا پورا حصہ نہیں ملا۔ جبری تبادلہ آبادی کی وجہ سے قتل و غارت ہوئی۔ کشمیر کا تنازعہ ابتداء ہی میں کھڑا ہو گیا۔ مہاجرین کی آبادکاری دونوں ممالک کے لیے مسئلہ تھے۔ اس طرح ابتداء ہی میں ہندوستان کے خلاف پاکستانیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات موجود تھے۔ ہندوستانی حکومت نے پہل کرتے ہوئے پاکستان کو جنگ نہ کرنے اور معاملات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کے لیے معاہدہ کرنے کی پیشکش کی۔ ستمبر 1949ء سے مئی 1950ء تک براہ راست مذاکرات ہوتے رہے مگر پاکستان کی طرف سے تنازعات کو عالمی عدالت میں لیجانے کی پیشگی شرط سے مذاکرات ناکام ہو گئے۔ حالات سدھرنے کی بجائے اور کشیدہ ہو گئے۔ اس حد تک کہ 1950ء کے آخر تک پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہر قسم کے معاشی و تجارتی تعلقات منقطع ہو گئے۔ اس کشیدگی کا اثر پاکستان پر اس طرح پڑا کہ پاکستان کو اپنی معاشی منصوبہ بندی میں فوج کو مضبوط کرنے اور اسلحہ کی خریداری کے لیے اپنی حیثیت سے زیادہ رقم خرچ کرنی پڑی۔ یہ پالیسی معاشی وسائل پر مستقل دباؤ پیدا کرتی رہی اور یہاں سے پاکستان کا رخ ایسے اتحادی کی تلاش کی طرف ہوا جو اس کو معاشی مدد کے ساتھ ساتھ فوجی لحاظ سے مضبوط کرے۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو اس کی معاشی صورتحال یہ تھی کہ کوئی ایک بھی صنعت ایسی نہیں تھی جس کا مالک پاکستانی ہو۔ برطانوی اجارہ داریاں موجود تھیں جیسے اٹک آئل کمپنی،

Sanjh Lok Raj

امپیریل ٹوبیکو کمپنی، امپیریل کیمیکل انڈسٹری، معدنیات کے لیے (Powell Duffsyn) بنکوں کا 90 فیصد سرمایہ "Grindly's bank" کا تھا۔ آزادی کے بعد ملک کو معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے صنعت کاری کی ضرورت تھی۔ مگر اس وقت کے حکمرانوں نے صنعت کاری کی بجائے درآمدات کو ترجیح دی۔ ہندوستان میں رہ گئی ہوئی صنعتوں سے جو ضروریات پوری ہوتی تھیں ان کے لیے یورپی ممالک سے رجوع کیا جانے لگا۔ 1950 میں ہارورڈ یونیورسٹی کا گروپ پاکستان کے معاشی مستقبل کی بنیادیں رکھنے آیا اور پہلے پنج سالہ منصوبہ کے نام پر منصوبہ بندی کی۔ جس میں بظاہر صنعت کاری کو فروغ دینے کا عندیہ دیا گیا۔ مگر یہ بتائے بغیر کہ سرمایہ کاری کہاں سے ہوگی؟ توانائی کے ذرائع کیا ہوں گے؟ آئرن اور سٹیل کہاں سے مہیا ہوگا؟ ڈومیسٹک انجینئرنگ انڈسٹری کے بغیر کیسے کھڑی ہوگی؟ دراصل اس منصوبے کے ذریعے امریکی امداد کا راستہ ہموار کیا گیا تھا ابتداء میں امریکہ نے ہندوستان کو روس کے خلاف اپنا ہمنوا بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر ہندوستان نے جلد ہی آئین بنا کر 26 فروری 1950ء کو Republic بننے کا اعلان کر کے امریکی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

1951ء میں ایران کے وزیراعظم ڈاکٹر مصدق نے شاہ ایران کا تختہ اُلٹ کر امریکہ کی تحویل سے تیل کے ایرانی کنوؤں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ امریکہ کے لیے فوری طور پر فوجی ایکشن کر کے تیل کے کنوؤں کا قبضہ واپس لینا مشکل تھا۔ کیونکہ ایشیا کے اس خطے میں امریکہ کے پاس نہ تو اتحادی فوج تھی نہ فوجی اڈے۔ ادھر مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں تیل سے وابستہ مفادات کا کوئی خاطر خواہ محافظ نہیں تھا۔ اب امریکیوں نے ہندوستان کے بارے میں سوچنا کم کر دیا اور پاکستان کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔

پاکستان کی سول بیوروکریسی جسے کالونیل دور میں کسی سیاسی ادارے یا سیاستدان کے ماتحت کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا 1951ء تک اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ پاکستان کے وزیراعظم کو ہٹا کر اقتدار پر قابض ہو چکی تھی۔ 1951ء ہی میں سیکرٹری دفاع سکندر مرزا کی سفارش پر کئی سینئر جرنیلوں کو پیچھے چھوڑ کر جنرل محمد ایوب خان کو پاکستان کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ ایوب خان کے بطور کمانڈر انچیف انتخاب کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ایک تو وہ سیاست سے دلچسپی نہیں رکھتا دوسرے ملٹری میں اس کا گروپ موجود نہیں۔ اس طرح 1951ء میں لیاقت علی

Sanjh Lok Raj

خان کے قتل اور جنرل ڈگلس گریسی کے ہٹائے جانے سے برطانوی سامراج کی آخری نشانیاں ختم ہوگئیں۔ اور امریکہ کی طرف ہمارا سفر شروع ہوگیا۔

9 فروری 1951 کو امریکی چار پوائنٹ ایجنڈا کے تحت پاکستان کو 5 لاکھ ڈالر کی امداد دی گئی۔ 2 فروری 1952 کو دس ملین ملے اور 27 مارچ 1953ء کے معاہدے کے تحت ٹیکنیکل ایڈ کی مد میں 34.2 ملین ڈالر دیئے گئے۔ ان معاہدوں کے نتیجے میں امریکہ کی پیشگی اجازت کے بغیر پاکستان کسی ملک سے تجارتی تعلقات قائم نہیں کرسکتا تھا۔ اس طرح پاکستان کی منڈی اب برطانوی اجارہ داریوں کے ساتھ ساتھ امریکہ کے اتحادی تمام صنعتی ممالک کے لیے کھول دی گئی۔ بس پاکستان روس اور انڈیا کے علاوہ تمام صنعتی ممالک سے تعلقات قائم کرسکتا تھا۔

1951ء ہی میں کچھ فوجی افسر جو پاکستان کو عالمی سامراج کی غلامی میں دیئے جانے کے خلاف تھے۔ ان کے خلاف پنڈی سازش کیس بنا کر انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح ایک طرف تو امریکہ کا پاکستانی حکومت پر اعتماد بحال کرنا مقصد تھا دوسری طرف فوج کے اندر سے اُٹھنے والی آئندہ کسی بغاوت کو کچلنے کا فوجی افسروں کو پیغام تھا۔

امریکہ کے معاشی اور فوجی ماہرین پاکستان کی معیشت اور فوج کو اپنی مرضی سے عالمی سامراجی مفادات کی مطابقت میں ڈھال رہے تھے۔ اس طرح 1951ء سے 1954ء تک کا دور پاکستان میں سیاسی اداروں کو ختم کر کے سول بیوروکریسی کے اقتدار پر مکمل قبضہ کرنے کا دور ہے۔ 1953ء میں پاکستان کے سیاست دان وزیراعظم، قائداعظم کے قریبی ساتھی خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر کے امریکہ میں پاکستانی سفیر محمد علی بوگرہ کو پاکستان کا وزیراعظم نامزد کر دیا گیا۔ تاکہ امریکہ کی طرف سے بھیجے گئے وزیراعظم کی نگرانی میں ملک کی معیشت اور دفاع کو عالمی سامراجی نظام کا حصہ بنایا جائے۔

پاکستان آرمی کی کہانی جنرل فضل مقیم کی زبانی کے مطابق 1953ء میں امریکہ کے ملٹری ایڈوائزر جی ایچ کیو راولپنڈی پہنچے۔ آرمی پلاننگ بورڈ تشکیل دیا گیا۔ امریکی افسروں پر مشتمل US Miltary Assistance Advisory Group) تشکیل دیا گیا۔ سٹڈی ٹورز۔ ٹریننگ ٹیمیں اور تمام فوجی ہیڈ کوارٹرز میں امریکی افسروں کی تعیناتی ہوگئی۔

Sanjh Lok Raj

1953ء اکتوبر کو جنرل ایوب اور وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے واشنگٹن کا دورہ کیا۔ اگلے ماہ گورنر جنرل غلام محمد نے امریکہ کا نجی دورہ کیا۔ دسمبر1953ء میں امریکی صدر نکسن کراچی آیا۔

16 نومبر1953ء کے نیویارک ٹائمز نے انکشاف کیا کہ ''پاکستان اور امریکہ ایک معاہدے پر متفق ہوگئے ہیں۔ اس معاہدے کے مطابق پاکستانی فوج کو جدید اسلحہ سے لیس کیا جائے گا جن پر250 ملین ڈالر خرچ آئیں گے۔ اس معاہدے سے حاصل ہونے والے نتائج میں امریکہ کو 13 ڈویژن پر مشتمل امریکی اشارے کی منتظر فوج اور روس کے نزدیک فوجی اڈے فراہم ہوں گے۔'' کالونیل دور ختم ہو چکا تھا اس لیے امریکہ سابقہ کالونیوں میں دوسو سالہ غلامی کے دور میں پروان چڑھائی گئی بیوروکریسی اور فوج سے یہ کام لیا جانا تھا۔

لیکن کسی ملک کی فوج اور بیوروکریسی تب ہی طاقتور ہوتی ہے جب ملک میں آئین نہ ہو، سیاسی پارٹیاں کمزور ہوں، لوگوں کو بنیاد پرستی کے ذریعے ذہنی پسماندگی میں رکھا جائے اور معاشی حالات کو ابتر رکھا جائے۔ پاکستان میں تعمیر ہو رہے سول ملٹری و عدالتی بیوروکریٹیک الائنس اور اس الائنس کے ذریعے پاکستان کو نیو کالونیل ریاست بنانے کے عمل میں پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی رکاوٹ بن سکتی تھی۔ کیونکہ ہندوستان میں آئین بن جانے کے بعد پاکستان کے لوگوں میں آئین سازی کا مطالبہ بڑھ رہا تھا۔

اکتوبر1954ء میں وزیراعظم پاکستان محمد علی بوگرہ اور کمانڈر انچیف ایوب خان امریکہ کے دورے پر گئے۔ واپسی پر110 ملین ڈالر امریکی امداد کا وعدہ لے کر آئے اور ایئرپورٹ سے سیدھے گورنمنٹ ہاؤس کراچی پہنچ گئے۔ اُسی شام گورنر جنرل غلام محمد جسے فالج ہو چکا تھا نے پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کو برطرف کر دیا۔24 اکتوبر1954ء کو پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی بیوروکریسی کے ہاتھوں رخصت ہوگئی۔ اس عمل میں پاکستان آرمی کی اشیر باد بھی تھی۔ اُسی دن اخبارات پر سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ لوگوں کے اجتماع پر پابندی لگا دی گئی اور نئی کابینہ تشکیل دی گئی جس میں ملک کے پہلے کمانڈر انچیف کو وزیر دفاع مقرر کر دیا گیا۔ اسکندر مرزا وزیر داخلہ بنا دیئے گئے۔1954ء میں پاکستان اور امریکہ نے بہت سے معاشی معاہدے کیے جن میں سب سے اہم تیل کی سپلائی اور تیل کے ذخیروں کو دریافت کرنے کا معاہدہ ہے۔ اسی سال پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدے بھی کیے جو

Sanjh Lok Raj

SEATO اور CENTO کہلاتے ہیں۔1954ء ہی میں پاکستان کی سپریم کورٹ نے گورنر جنرل کے آئین ساز اسمبلی کو برطرف کرنے کے حکم کو آئینی قرار دے دیا اور پاکستان پر سول بیوروکریسی کی بالادستی قائم کر دی۔

1954ء سے1958ء تک کا دور پاکستان میں سول بیوروکریسی کو ہٹا کر فوج کی بالادستی کو قائم کرنے کا دور ہے۔ دفاعی معاہدوں کے بعد امریکہ اور پاکستانی فوج کے براہ راست تعلقات قائم ہو گئے۔اب امریکی امداد براہِ راست پاکستانی آرمی کو ملنے لگی۔

اس براہ راست امداد کا کوئی حساب کتاب کبھی کسی منتخب حکومت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ برطانوی دور حکومت میں آزادی کے لیے اُٹھنے والی قوتوں کو جس (Internal security) کے نام پر کچل دیا جاتا تھا۔ اُسے قیامِ پاکستان کے بعد امریکی دفاعی معاہدوں کے نتیجے میں ''نیشنل سیکورٹی'' کا نام دے دیا گیا۔ پاکستان کی معاشی سیاسی ترقی اب نیشنل سیکورٹی کے ماتحت کر دی گئی۔ بعد ازاں نیشنل سیکورٹی کو نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا نام دیا گیا اور فوج کی انٹیلی جنس ایجنسیاں نظریاتی سرحدوں کی اس حد تک حفاظت کرتی نظر آئیں کہ الیکشن کے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے سیاسی پارٹیوں کے اتحاد بنانا اور پھر ان میں سے کچھ پارٹیوں کو نکالنا اور دوسری قسم کے نتائج حاصل کرنا یہ سب انہی کا کام رہا۔ مہران بنک سکینڈل کیس یہی ہے کہ آئی ایس آئی نے کس طرح اسلامی جمہوری اتحاد بنوایا اور کس کس لیڈر کو کتنی رقم دی گئی۔ پاکستان کی پوری تاریخ میں جس عرصے میں فوج اقتدار پر قابض رہی ہے اس کے علاوہ باقی وقت میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کی مرضی سے سول حکومتیں بنی۔ فوج کا عمل دخل سیاسی حکومتوں میں اس حد تک ہے کہ پاکستان کی زندگی میں پہلی دفعہ کیری لوگر بل کے نام پر امداد سول حکومت کو دی جانی تھی۔ فوری طور پر کور کمانڈروں کا اجلاس بلایا گیا اور کیری لوگر بل پر تحفظات کا اظہار کر دیا گیا۔

Sanjh Lokraj

مارشل لاء

ہم پاکستانیوں کی نصابی، کتابی، مذہبی اور اخباری معلومات کے مطابق زندگی کا ہر شعبہ اپنا الگ الگ وجود رکھتا ہے۔ اس طرح کہ زندگی کے ایک شعبے کا دوسرے شعبے سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ ہم معیشت کو زندگی کی الگ سرگرمی سمجھتے ہیں اور سیاست کو اس سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ معاشرے میں موجود طبقات کو الگ چیز تصور کرتے ہیں اور سیاسی نظام سے اس کو جدا جانتے ہیں۔ اسی طرح ہم سماجی ڈھانچے کو ایک الگ چیز تصور کرتے ہیں اور ریاستی نظام کو اس سے الگ۔ ریاستی نظام کو اندرونی چیز سمجھتے ہیں اور عالمی معاشی اثرات سے اس کو لاتعلق سمجھتے ہیں۔

اس طرح یہ نتیجہ نکالنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ کسی ایک شخص کی بدحالی کا ذمہ دار اس ملک کا معاشی نظام نہیں، نہ ہی اس معاشی نظام کا ملک کی ریاست پر قابض طبقے سے کوئی رشتہ ہے، اور نہ ہی ریاست کا عالمی سامراج سے کوئی تعلق ہے۔ لہٰذا اس شخص کی بدحالی اس کی اپنی ہی کسی بدعملی کا نتیجہ ہے، بس وہ اپنے اعمال کو درست کرے اور بدحالی سے نجات حاصل کرے۔

مارشل لاء کو بھی ملک کے اندرونی معاشی نظام سے الگ اور عالمی سامراج کی عالمی منصوبہ بندی سے لاتعلق بتایا جاتا رہا ہے۔ کچھ لوگ اسے سیاستدانوں کی نااہلی، کرپشن اور ملک میں سیاسی عدم استحکام کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ مارشل لاء کسی ملک کی فوج کا اپنے ہی ملک پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح مارشل لاء لگانے والے ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی نشوونما روک کر اسے عالمی سامراجی معاشی مفادات کے تابع کر دیتے ہیں۔ مارشل لاء اور سامراج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم اس دعوے کی سچائی کو دیکھنے کے لیے فوجی حکومتوں کے دوران

Sanjh Lok Raj

نافذ کی جانے والی معاشی پالیسیوں کی معلومات حاصل کریں گے۔ مارشل لاء کے نیوکالونیل کردار کو چھپانے کے لیے کئی پرفریب نعروں کا سہارا لیا جاتا تھا۔ جیسے ایوب خان کے مارشل لاء میں ان معاشی پالیسیوں کو ''سبز انقلاب'' کا نام دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے معاشی پالیسیوں کا نفاذ نظام مصطفیٰ اور اسلامائیزیشن کے نام پر کیا اور پرویز مشرف نے وہی عمل گڈ گورننس اور روشن خیالی کے نام پر دُہرایا۔

اگر آپ پاکستان کے اقتدار پر شب خون مارنے والے ان تینوں جرنیلوں کی آؤٹ آف ٹرن ترقی اور فوج کے سربراہ کے طور پر تعیناتی کے اگلے دن کے اخبارات پڑھیں تو اِن میں ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی کہانیاں، ملک و قوم پر جان قربان کر دینے کا جذبہ ملکی سالمیت کی طرف بُری نگاہ ڈالنے والے کی آنکھیں نکال لینے کا عزم اور سب سے بڑھ کر ان کی سیاست میں عدم دلچسپی بلکہ سیاست سے بیزاری کے قصّے چھپے ہوتے ہیں اُس وقت تو ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود نہیں ہوتا جس سے ہمیں پتہ چلے کہ ان کی آؤٹ آف ٹرن ترقی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ مگر ان کی معاشی پالیسیاں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔

ان میں سے کوئی بھی جرنیل ملک میں جمہوری عمل کو روکنا نہیں چاہتا تھا۔ بس سیاسی عدم استحکام انھیں سیاست میں دھکیل دیتا تھا۔ پھر جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے کے لیے یہ جمہوری اداروں ہی کو ختم کر دیتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگ جاتی تھی۔ کارکنوں کو جیلوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اخبارات پر سنسرشپ عائد ہو جاتی تھی۔

تینوں نے قوم سے اپنے پہلے خطاب میں ملک کو جلد جمہوریت کی راہ پر گامزن کر دینے اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دینے کا عہد کیا اس کے بعد ''مطلوبہ نتائج'' حاصل کرنے تک اقتدار سے چمٹے رہے۔ مطلوبہ نتائج کی تشریح اس باب کا مقصد ہے۔ پھر تینوں جرنیلوں نے بلدیاتی اداروں کے ذریعے عوام میں سے قیادت پیدا کی اور اپنی اپنی مسلم لیگ بنا کر خود کو قائداعظم کا جانشین بنانے کی کوشش کی۔ ان کے دور اقتدار میں سرکاری میڈیا پاکستان کے سسٹم میں خرابیاں، پاکستان کے لوگوں کا غیر جمہوری مزاج، مغربی جمہوریت کا تیسری دنیا کے ممالک میں موزوں نہ ہونا، نظریہ پاکستان کی تکمیل بذریعہ فوجی حکومت اور سیاستدانوں کی خامیاں بیان کر کے ملک میں فوجی آمریت کا جواز بیان کرتے

Sanjh Lok Raj

رہتے تھے۔

ان تینوں جرنیلوں کی بہت سی پالیسیوں میں یکسانیت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں اور سامراج کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ان کی پالیسیاں مختلف بھی رہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک سرمایہ دار طبقہ کی راہنمائی میں چل رہی تھی اس تحریک کے نتیجے میں ہندوستان کو برطانوی سامراج کی طرف سے جو جمہوری مراعات حاصل ہوئیں انھیں آئینی اصلاحات کی شکل دی جاتی رہی۔ لیکن 1917ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جس سے سرمایہ داری نظام کے علمبرداروں کو اپنے مفادات کے خاتمے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا وہ تحریک آزادی کو اس قدر آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے جس کے نتیجے میں تحریک کی راہنمائی ان کے ہاتھوں سے نکل کر انقلابیوں کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ اس خطرے کو سامراج نے بھی بھانپ لیا لہٰذا وہ جلدی میں ہندوستان کی تقسیم کر کے چلتے بنے۔

1917ء کے انقلاب کے بعد دنیا میں آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب یورپی سامراجی ممالک کمزور ہو گئے اور عالمی سرمایہ داری کے قیام کے لیے امریکہ کی سربراہی میں اکٹھے ہو گئے تو جدید نوآبادیاتی نظام کا آغاز ہوا۔ عالمی سامراج کے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ سابقہ کالونیوں کی مقامی پیداواری قوتوں کی آزاد نشوونما کو کیسے روکا جائے۔ ظاہر ہے یہ کام عوام کے منتخب نمائندے تو کر نہیں سکتے تھے اس لیے سابقہ کالونیوں میں فوجی آمریتوں کے ذریعے نیو کالونیل پالیسیاں نافذ کرنے کی حکمت عملی اپنائی گئی۔

Sanjh Lok Raj

سبز انقلاب

1954ء تک بیوروکریسی پاکستان کے اقتدار پر مکمل طور پر قابض ہو چکی تھی۔ فوج اس اقتدار میں جونیئر شراکت دار کے طور پر شامل تھی۔ پہلی مجلس قانون ساز رخصت کی جا چکی تھی۔ امریکہ پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدوں اور فوجی مشقوں کے ذریعے فوج کے جرنیلوں سے اپنے براہ راست تعلقات استوار کر چکا تھا۔1953ء میں جنرل ایوب خان کو ریٹائر ہو جانا تھا مگر نوزائیدہ ممالک کی فوج کی تنظیم نو کے لیے انھیں مدت ملازمت میں 5 سال کی توسیع مل گئی۔ اب ایوب خان کو1958ء میں ریٹائر ہونا تھا۔ اس دوران بیوروکریسی اور فوج نے مل کر آئین نہیں بننے دیا۔ مگر آئین بنانے کے لیے سیاسی حلقوں کی طرف سے دباؤ موجود تھا۔ یہاں تک کہ1956ء میں ایک غیر جمہوری آئین بنا دیا گیا۔ اور اس کے نفاذ کے دو سال کے اندر اندر پاکستان میں جنرل الیکشن کا اعلان کر دیا گیا۔ تا کہ اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل ہو جائے اور کاروبار مملکت آئین کے مطابق چلایا جا سکے۔

ملک میں سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئیں، الیکشن اتحاد قائم ہوئے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی سیاسی پارٹیوں نے جو معاشی و سیاسی ایجنڈا پیش کیا اس کے مطابق ''جاگیرداری کا خاتمہ کر کے پبلک سیکٹر میں بنیادی و بھاری صنعتیں لگانے کی تجویز پیش کی گئی فولاد اور مشینیں بنانے کے کارخانے لگائے جانے اور غیر ملکی قرضوں کو ملک کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے صرف کیے جانے کا منصوبہ پیش کیا گیا۔ پبلک سیکٹر کے قیام کے ذریعے نجی شعبہ کی نشوونما اور تجارتی سرمایہ دار کو صنعتی سرمایہ دار بننے میں مدد دینے کا پروگرام پیش کیا گیا۔''

ملکی معیشت کو صنعتی بنیادوں پر استوار کرنا اور سرمایہ داری کی آزاد نشوونما کے لیے

Sanjh Lok Raj

جمہوری اداروں کو مستحکم کرنا ان سیاسی قوتوں کا ایجنڈا تھا۔ اس پروگرام کی تشہیر اُس وقت کے میڈیا کے ذریعے کی جا رہی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ پاکستان کا مستقبل ان سیاسی قوتوں کے ہاتھ میں ہوگا۔

خدشہ یہ تھا کہ اس طرح کے معاشی پروگرام سے قومی سرمایہ دار کو مضبوط کرنے سے قدرتی طور پر اس کا تضاد عالمی سرمایہ داری سے بن جاتا۔ اس مرحلے پر پاکستان کے برسراقتدار طبقے نے فیصلہ کرنا تھا کہ کیا پاکستان میں قومی سرمایہ داری کے قیام کے ذریعے پاکستان کو قومی ریاست بنایا جائے یا مارشل لاء لگا کر جمہوری قوتوں کے ان عزائم کو خاک میں ملا کر پاکستان کو نیو کالونیل سٹیٹ رکھا جائے۔

لہٰذا ایوب خان نے اپنی ریٹائرمنٹ سے چند دن قبل پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی۔ اخبارات پر سنسر شپ عائد کر دی اور ایک بلدیاتی نظام متعارف کروایا تا کہ ملکی سیاست کے محور کو صنعتی معیشت اور قومی خودمختاری کی لڑائی سے بدل کر سڑکوں، گلیوں، نالیوں اور تعمیر و ترقی پر لایا جائے۔

تاریخ کا کوئی طالب علم روس کے 1917ء کے انقلاب کی عالمگیر اثرات سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس انقلاب کی وجہ سے عالمی سیاست میں جو بنیادی تبدیلیاں آئیں ان میں سے ایک تو پوری دنیا میں فلاحی مملکت کے قیام کی بات چلی جس کا مطلب تھا کہ ریاست لوگوں کو مفت تعلیم فراہم کرے، مفت علاج کی سہولتیں مہیا کرے، ان کے روزگار کا بندوبست کرے وغیرہ۔

دوسرا تصور جو سرمایہ دار ممالک میں اس انقلاب کی وجہ سے پیدا ہوا وہ ہے پبلک سیکٹر کا قیام یعنی ریاستی سرمایہ کاری سے صنعت کا قیام۔ اس سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام میں معاشیات کے کسی بھی میدان میں ریاستی مداخلت کو زہر قاتل سمجھا جاتا تھا، لیکن (1929-1930) کے شدید عالمی معاشی بحران (Great Depression) سے نکلنے کے لیے ریاستی مداخلت و منصوبہ بندی کا سہارا لینا پڑا۔

برصغیر پاک و ہند میں اس سے پہلے سامراجی مفادات کے حصول کے لیے ریل، تار، ٹیلی فون، بجلی گھر، تیل، کوئلے، نمک اور دوسری معدنیات، اسلحہ کے کارخانوں، گودیوں

Sanjh Lok Raj

ہوائی جہازوں، بنکوں اور اس قسم کے دوسرے اہم شعبوں کو ریاستی ملکیت ہی میں قائم کیا گیا تھا۔ یہی حکمت عملی سابقہ کالونیوں میں اپنائی گئی۔ وہاں مارشل لاء کے زیر اثر ریاستی سرپرستی میں معاشیات کو اس طرح پروان چڑھایا گیا کہ وہاں پیداواری قوتوں کی آزاد نشوونما نہ ہو اور سابقہ کالونیوں کے دور دراز علاقے بھی عالمی سرمایہ داری نظام کی منڈی کا حصّہ بن جائیں۔

ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر جو معاشی پالیسی اپنائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشروط قرضوں کے ذریعے طفیلی اور گماشتہ سرمایہ داری کی نشوونما کی جائے۔ بھاری اور بنیادی صنعت قائم نہ ہونے دی جائے مشینری اور کل پرزوں کے لیے ہمیں صنعتی ممالک پر انحصار کرنا چاہیے۔ لیکن ہم یہاں رک کر طفیلی سرمایہ داری کو چند مثالوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ کہتے ہیں آپ زرعی ملک ہیں۔ زراعت پاکستانی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے اب آپ کو زراعت میں پیداوار بڑھانے کے لیے ٹریکٹر کھادیں، بیج، کیڑے مار ادویات کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ عالمی مالیاتی اداروں سے جو قرض لیتے ہیں۔ اس کی شرائط کے تحت نہ تو آپ ٹریکٹر کا کارخانہ لگا سکتے ہیں۔ نہ کھاد اپنی بنا سکتے ہیں پھر آپ کیا کریں؟ آپ ایسا کریں کی پیپسی اور میکڈونلڈ کے برگر میں سرمایہ کاری کریں۔ کل لاگت کا 49 فیصد پاکستان سرمایہ کار کا ہو اور 51 فیصد امریکہ سرمایہ کار کا ہوگا۔ یہ پیپسی اور برگر پاکستان کی منڈی میں فروخت ہوگا۔ اس کا منافع 51 فیصد کی نسبت سے امریکی سرمایہ کار اپنے ملک میں لے جائے گا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ آپ پاکستان میں جوتے بنانے کا کارخانہ لگا لیتے ہیں کیونکہ یہاں مویشیوں کو پالا جاتا ہے اور جوتے کا اہم خام مال یعنی کھال سستے داموں میسر آ جاتی ہے۔ اب پروسیسنگ کی طرف آیئے۔ کھال کو نرم کرنے کے لیے استعمال ہونے والے سارے کیمیکل غیر ملکی ہیں، مشینری غیر ملکی ہے۔ کھال کو نرم کرنے کے بعد اس کی کٹائی اور سلائی میں جو اوزار استعمال ہوتے ہیں، سوئی اور دھاگا غیر ملکی ہے۔ تلوے کو اپر کے ساتھ جوڑنے کے لیے جو سالوشن استعمال ہوتا ہے وہ غیر ملکی ہے، پالش غیر ملکی ہے۔ یعنی خام کھال کو جوتا بننے کے عمل تک 21 چیزیں استعمال ہوتی ہیں وہ سب کی سب غیر ملکی ہیں۔ اس طرح کی صنعت بھی طفیلی یا گماشتہ صنعت کہلاتی ہے۔

Sanjh Lok Raj

کچھ صنعتیں ایسی ہیں جن میں مینوفیکچرنگ کے ابتدائی مراحل پسماندہ ممالک میں مکمل کیے جاتے ہیں اور یہ حصّے بعد میں بڑی مشینری کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ جیسے تانبے کی کوائل پاکستان میں بنے اور یہ کوائل راکٹ میں امریکہ جا کر لگے۔ مثلاً کاسمیٹکس میں استعمال ہونے والے ایلوویرا کی کاشت پاکستان میں کی جاتی ہے۔ پھر اسے کچھ ابتدائی مراحل سے گزار کر فرانس بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں سے تیار شدہ کاسمیٹکس اور کیمیائی ادویات پاکستان آتی ہیں جو خام مال کی قیمت سے ہزاروں گنا زیادہ قیمت پر ہمیں بیچی جاتی ہیں۔ گماشتہ سرمایہ داری کی دوسری مثال زراعت میں سرمایہ داری کی نشوونما ہے۔ چنانچہ سابقہ کالونیوں میں بنیادی صنعت کاری کے قیام کو روک کر انھیں صنعتی ممالک کی مصنوعات کی منڈی رکھنا۔ مشروط قرضوں کے ذریعے پسماندہ ملک کی معاشی نشوونما فوجی حکومتوں کے ذریعے روک کر انھیں اپنے مفادات کے تابع کرنا۔ گماشتہ سرمایہ داری کی نشوونما کرنا یعنی سرمایہ دارنہ انداز میں ترقی ہوتی ہوئی نظر آئے۔ ملکی معیشت میں تبدیلیاں بھی رونما ہوں لیکن حقیقت میں معیشت سامراج کی محتاج رہے نیو کالونیل ازم یا جدید سامراجیت کہلاتا ہے۔

کسی بھی ملک میں نیو کالونیل ازم جمہوری اداروں کی موجودگی میں نہیں پنپ سکتا۔ اس وجہ سے آمریت اور سامراجیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی سماج کی کوکھ میں جنم لینے والی پیداواری قوتوں کو اپنی استحصالی پالیسیوں کی وجہ سے تباہ و برباد کرنا ہی سامراجیت ہے۔ ایوب خان کے دور میں زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت اپنایا گیا۔ جس کے تحت ٹریکٹر، ٹیوب ویل، نئے بیج، مصنوعی کھاد، کیڑے مار ادویات کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ بجلی مہیا کرنے اور کاشتکار کی پیداوار منڈی تک لانے کے لیے سڑکوں کا جال بچھایا گیا۔ جس سے سامراجی ممالک کے مال کی کھپت کے لیے منڈی وسیع ہونے لگی۔ پاکستان کے دورو دراز علاقے بھی نئی سڑکوں کی وجہ سے عالمی اجارہ دار سرمایہ داروں کے منافعوں کی گرفت میں آنے لگے۔

زراعت میں سرمایہ داری کی وجہ سے گاؤں میں بیروزگاری پیدا ہوئی۔ جس سے لوگ سستے مزدور بن کر شہروں کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح گماشتہ سرمایہ داروں کو سستی لیبر مہیا کرنے میں زرعی سرمایہ داروں کا تعاون حاصل رہا۔ چونکہ گماشتہ سرمایہ دار طبقہ نے نئے سامراج اور

Sanjh Lok Raj

پرانے جاگیر دار طبقہ کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے نشوونما نہیں پائی تھی۔ اور آمریت کے سائے تلے ترقی کی تھی۔اس پالیسی سے جو نتائج نکلے اسے سبز انقلاب کا نام دیا گیا۔

اس وقت دنیا سرمایہ داری اور سوشلزم کی کشمکش کی لپیٹ میں تھی ۔۔۔۔۔ملکوں میں آزادی کی تحریکیں چلی رہی تھیں۔ پاکستان کے اندر جاگیرداروں اور ابھرتے ہوئے تجارتی اور گماشتہ سرمایہ داروں کی پس پردہ باہمی جنگ و جدل، نئے پیداواری تعلقات اور نئی پیداواری قوتوں سے جنم لینے والے نئے خیالات، نئے شعور اور نئے نظریات نے جنم لیا۔ ایوب خان کے خلاف تحریک پھوٹ پڑی۔

مفلوج سرمایہ داری کے چوکیدار ایوب خان کی دس سالہ آمریت پانچ مہینے لمبی احتجاجی مہم کا مقابلہ نہ کرسکی۔1969ء کو ایوب خان کو جانا پڑا۔

عوامی طاقت کو نکیل ڈالنے کے لیے نیا مارشل لاء آ گیا۔ یحییٰ خان نے اقتدار سنبھال لیا لیکن یہ مارشل لاء عوام کے الیکشن کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے کے دیرینہ مطالبے کو نہ روک سکا۔1970ء میں الیکشن ہوئے جس کے نتائج فوج اور بیوروکریسی کی مرضی کے خلاف نکلے۔ پاکستان کی فوج، بیوروکریسی اور مغربی پاکستان کی جاگیرداری شیخ مجیب الرحمان کو اقتدار منتقل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ الیکشن کے نتیجے میں جس شخص کو وزیراعظم بننا تھا وہ جیل میں تھا اور جس کو اپوزیشن لیڈر کے فرائض سرانجام دینے تھے، وہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے نتیجے میں باقی آدھے پاکستان کا پہلا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گیا۔ پاکستان کے عوام کی انتھک سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں ان کو سول مارشل لاء ملا۔

Sanjh Lok Raj

22 خاندان اور اہم اجارہ دار گروپ

نمبر شمار	گروپ کا نام	قومیت/ برادری	کام کا اہم شعبہ	کمپنیوں کی تعداد	حجم ملین
1	حبیب	خوجہ،شیعہ، گجراتی	بنک ،انشورنس، ٹیکسٹائل ،شوگر، کپاس ، کاغذ،تعمیرات،تجارت	45	7
2	سہگل	پنجابی	ٹیکسٹائل، کیمیکل ،شوگر، گھی،تعمیرات، پریس، بنک ،انشورنس،تجارت	28	6
3	آدم جی	میمن، گجراتی	ٹیکسٹائل ، کیمیکل ،شوگر، چائے ، کاغذ، مشین سازی، بنک، انشورنس،تجارت	21	3
4	داؤد	میمن	ٹیکسٹائل، کاغذ، کوئلہ، جہاز سازی، تیل گیس ، انشورنس، اندرونی و بیرونی تجارت	21	2
5	شیخ اسماعیل	چنیوٹی پنجابی	سیمنٹ، ٹیکسٹائل، آٹا، کپاس ، گھی، مچھلی، بنک ،تجارت	35	1
6	فینسی	خوجہ، اسماعیلی، گجراتی	معدنیات، کیمیکل ، ٹیکسٹائل، کاغذ، دھات سازی، تیل گیس، مچھلی، ریفریجریٹرز، اشتہارات، بنک، انشورنس	46	1

Sanjh Lok Raj

7	ولی بھائی	بوہرا، گجراتی	ٹیکسٹائل، سیمنٹ، کیمیکل، جہاز سازی، مشین سازی، انشورنس، تجارت	21	7
8	امین برادران	چنیوٹی	ٹیکسٹائل، معدنیات، خوراک، تیل، اندورنی و بیرونی تجارت	14	550
9	محمد بشیر	چنیوٹی	ٹیکسٹائل، کاغذ، شوگر، تجارت، انشورنس	10	450-40
10	حبیب	میمن	انشورنس، ٹیکسٹائل، ماچس، کھانے پینے کی اشیاء، گھی، بنک، اندورنی و بیرونی تجارت	11	400
11	بھاوانی	میمن	ٹیکسٹائل، کیمیکل، شوگر، مشین سازی، چائے، تجارت	30	400-350
12	گوہر حبیب (گندھارا)	پشتون	مشین سازی، گاڑیوں کی صنعت، سیمنٹ، ٹیکسٹائل	27	350
13	سٹینڈرڈ بنک علی برادران	لکھنوء انڈیا	شوگر، الیکٹرک، تمباکو، ماہی گیری، ٹریکٹر سازی، پریس، تجارت، انشورنس	7	760
14	کریم	میمن	ٹیکسٹائل، ماچس، کیمیکل، دھات سازی، اندرونی و بیرونی تجارت	27	250
15	مولا بادشاہ	چنیوٹی	کاغذ، کپاس، شوگر، جہاز سازی	23	250
16	حبیٔ سنز	جنوبی انڈیا	شوگر، الیکٹرک، تمباکو، ماہی گیری، ٹریکٹر سازی، پریس، تجارت، انشورنس	17	250
17	رامضانی	بمبی، شیعہ	ٹیکسٹائل، ماچس، چائے، زرعی کھاد، شیشہ، اندورنی و بیرونی تجارت	16	250
18	وزیر علی	پنجابی شیعہ	کاغذ، ٹیکسٹائل، بجلی، گھی، مشین سازی	13	250

Sanjh Lok Raj

19	عباس خلیلی	مدراسی شیعہ	تعمیرات، غذا، تیل، سینما صنعت، انشورنس	13	250
20	ہوتی کے نواب	پشتون	کاغذ، شوگر، کیمیکل، کھانے پینے کی اشیاء	8	250
21	نشاط	چنیوٹی	ٹیکسٹائل، کپاس، کیمیکل، ربڑ، اندرونی و بیرونی تجارت، انشورنس	18	250
22	میاں حاجی دولت محمد	چنیوٹی	کاغذ، کیمیکل، گھی، کپاس، تجارت	20	250
23	رنگون والا	میمن	ٹیکسٹائل، گھی، شوگر، کیمیکل، دھات سازی، اندرونی و بیرونی تجارت،	24	200-150
24	منو	چنیوٹی	ٹیکسٹائل، کیمیکل، ٹرانسپورٹ کی گاڑیوں کا کارخانہ، کاغذ	22	200-150
25	ایم ایم علی بخش	چنیوٹی	آٹا، گھی، شوگر، کاغذ، تجارت، کپاس کی برآمد	22	175-150
26	پاکولا والا	میمن	ٹیکسٹائل، مشروب سازی، اندرونی و بیرونی تجارت	9	150
27	حسین ابراہیم	میمن	ٹیکسٹائل، کیمیکل، شیشہ سازی، انشورنس	12	150
28	سردار بہادر خاں ظفر الحسن	پشتون	ٹیکسٹائل، کیمیکل، شوگر	9	140
29	اے کے خان	بنگالی	ٹیکسٹائل، لکڑی، بجلی، مشین سازی، جہاز سازی، مرمت، تجارت	16	150
30	مرکری کنڈا والا	پارسی	جہاز سازی، نمک، کپاس، شیشہ، مشروبات، سپیئر پارٹس	22	125

Sanjh Lok Raj

31	ریاض و خالد	چنیوٹی	ٹیکسٹائل، کیمیکل، ماہی گیری، ٹرانسپورٹ، کپاس، اون کی برآمد	7	100
32	فضل حنیف، فضل شفیق	چنیوٹی	ٹیکسٹائل، پریس، اون، ریفریجریٹرز، تمباکو، اندرونی و بیرونی تجارت	19	100
33	دادا۔دوسا	میمن	چمڑا، کپاس، صابن، گھی، دھات سازی، کاغذ، ٹیکسٹائل، تجارت، بنک	30	100
34	اکبر جی	میمن	ٹیکسٹائل، سیمنٹ، تیل، زراعت، تجارت	10	100
35	حافظ	میمن	ٹیکسٹائل، تجارت	3	100
36	حاجی احمد حاجی ہاشم	میمن	شوگر، تمباکو، ماچس، قرضے دینے والے ادارے، تجارت	6	100
37	آدم	میمن	شوگر، گھی، چاول، چائے، ٹیکسٹائل، اون، نمک، اندرونی و بیرونی تجارت	8	100
38	ہارون	میمن	پریس، سینما، کاریں، کیمیکل، کسٹائل، تیل، خدمات کا شعبہ، انشورنس، اندرونی و بیرونی تجارت	17	100
39	دادا بھائی	میمن	ٹیکسٹائل، دھات سازی، کاغذ، ظروف سازی، اندرونی و بیرونی تجارت	19	100
40	جعفر برادرز	میمن	کھاد، ریڈیو و فلم کی صنعت، مشین سازی، شوگر، ماہی گیری، تجارت	22	150-100
41	مل والا	جوہرا	جہاز سازی، ٹیکسٹائل، دھات سازی، انشورنس، تجارت	17	100
42	چوہدری عبداللطیف	پنجابی	مشین سازی، دھاتوں کی برآمد و درآمد	4	150

Sanjh Lok Raj

43	والٹی سوات	پشتون	شوگر، زرعی مشینری کی پیداوار	2	100
44	فیروز سنز	پنجابی	پریس، کتابیں، کیمیکل، آٹا، گھی، شوگر، تجارت، خدمات	15	100
45	غلام فاروق	پشتون	شوگر، بنک	4	100
46	چنیوٹی رحمت اللہ	خوجہ، اسماعیلی	رہائشی و صنعتی تعمیرات، کیمیکل، مشین سازی، تجارت	18	100
47	نون	پنجابی	شوگر، دودھ، ٹیکسٹائل، میک اپ	7	100
48	ایس اے محمد	مدراسی	تمباکو، تجارت	5	100

Sanjh Lok Raj

تحریک نظام مصطفیٰ

قیام پاکستان سے سانحہ مشرقی پاکستان تک کی 25 سالہ تاریخ میں پاکستان کے اقتدار پر کالونیل بیوروکریسی، کالونیل فوج، کالونیل عدالتیں اور کالونیل جاگیرداروں نے ایک دوسرے کی طاقت بن کر پاکستان کے عوام پر حکومت کی۔ ان چاروں اجزاء پر مشتمل کالونیل ورثے کو اسٹیبلشمنٹ کہتے ہیں۔

25 مارچ 1969ء کو جنرل یحییٰ خان نے عوامی تحریک کو کچلنے کے لیے مارشل لا لگا دیا۔ مگر اس تحریک کا دباؤ اتنا تھا کہ یحییٰ خان کو عوام کو فوری طور پر انتخابات کروانے کی یقین دہانی کروانی پڑی۔

ایوب مخالف مظاہروں کی فوری وجہ تو اشیائے صرف کی بڑھتی ہوئی قیمتیں تھیں مگر یہ دراصل بڑھتی ہوئی عدم مساوات کے خلاف ردِعمل تھا اس تحریک کی سربراہی طلبہ، صنعتی مزدور طبقہ اور وکلاء کر رہے تھے۔1970ء کے الیکشن میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کا سوشلزم کے نعرے پر مغربی پاکستان میں قطعی اکثریت حاصل کرنا عکاسی کرتا ہے کہ ایوب مخالف تحریک کے مطالبے کیا رہے ہوں گے۔ الیکشن کے نتائج نے بتایا کہ عوام اپنے منتشر خوابوں کی تعبیر کو کس طرح لفظ سوشلزم میں دیکھتے تھے۔

7 دسمبر 1970ء کو قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ آزاد انتخابات منعقد ہوئے مگر انتخابات کے نتائج نے اسٹیبلشمنٹ کو حیرت میں ڈال دیا جب مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان کی 162 میں سے 160 نشستیں جیت لیں اور پیپلز پارٹی نے مغربی حصّے میں 81 نشستیں حاصل کر کے قطعی اکثریت حاصل کر لی۔ مگر اسٹبلشمنٹ کسی صورت میں اقتدار منتخب نمائندوں

Sanjh Lok Raj

کے سپرد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

یحییٰ خان نے یکم مارچ 1971ء کو منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کر دیا بنگالیوں کو ان کا جمہوری حق دینے کی بجائے 25 مارچ 1971ء کو بنگالیوں پر فوج کشی کی، بے دردی سے سڑکوں پر خون بہایا۔ آخرکار پاکستانی فوج کو ہندوستان کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوئی اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔

اس شکست کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ نے فیصلہ کیا کہ اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دیا جائے کیونکہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اب ان کے اقتدار میں رہنے کا جواز نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ابتدا ہی میں پیپلز پارٹی کی حکومت کو ایک ناکام فوجی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جس کی منصوبہ بندی چالیس افسروں نے کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ابتدائی چار ماہ میں فوجی ہائی کمان میں ایک بڑی تبدیلی کی گئی۔ یحییٰ خان کی حکومت سے منسلک 43 اعلیٰ فوجی افسروں کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ جن میں لیفٹننٹ جنرل گل حسن خان، چیف آف آرمی سٹاف ائیر مارشل رحیم خان وغیرہ شامل تھے۔ یہ فوج پر سویلین حکومت کی بالادستی کا پہلا اشارہ تھا۔ پھر 1973ء کے آئین میں فوجی حکومت کے قیام کو غداری کے مترادف جرم قرار دیا گیا۔ چیف آف آرمی سٹاف کی مدت ملازمت کو کم کر کے تین سال کر دیا گیا۔

بھٹو نے بیوروکریسی کو بھی لگام دینے کی کوشش کی۔ دسمبر 1971ء میں قوم سے اپنے پہلے خطاب سے چند ہی گھنٹے قبل روئیداد خان کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا اور ایوب خان کے قریبی ساتھی الطاف گوہر کو قید کر دیا۔ اصلاحات کے ابتدائی مرحلے پر 1972ء میں 1300 سول سرونٹس کو نوکری سے سبکدوش کر دیا گیا اور 20 اگست 1973ء کو سول سروس آف پاکستان کے کیڈر کو ختم کر دیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس معاشرے کے ادارے، خیالات، نظریات اور قانون وغیرہ جاگیرداری پیداواری تعلقات پر قائم ہوں وہاں سیاسی پارٹیاں کسی پروگرام سے متفق لوگوں کی تنظیم نہیں ہوا کرتیں بلکہ کسی شخص کے گرد اس کے وفاداروں کا بے ترتیب ہجوم ہوا کرتی ہیں۔ ان وفاداروں کے درمیان خوشامد اور چاپلوسی کا مقابلہ رہتا ہے۔ شخصیت سے وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اچھا کرے یا برا

Sanjh Lokraj

وفاداروں کو اس پر آنکھیں بند کر کے آمین کہنا ہوتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو سندھ کے ایک جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ 1958ء میں بغیر کسی سیاسی جدوجہد کے سکندر مرزا کی کابینہ میں شامل کر لیے گئے۔ انھوں نے اپنا پورا دور اقتدار بادشاہ کی طرح گزارا۔ پارلیمنٹ کو بادشاہ کا دربار سمجھا۔ کسی کے مشورے کو خاطر میں نہیں لائے۔ وفاداروں کو نوازا اور اپوزیشن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بادشاہ اپنے باغیوں سے کرتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اگر کوئی غلطی کی تو اس کے حامیوں نے اس غلطی کے جواز میں صفائیاں پیش کیں۔ ایسے ایسے دلائل پیش کیے گئے اور اس کی ذات کو معصوم اور غلطیوں سے پاک ثابت کیا گیا۔ بھٹو نے اگر کوئی بھلائی کا کام کیا تو مخالفین نے اس کو بھی ایک چال سمجھا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ کلچر دراصل جاگیرداری پیداواری تعلقات کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

اس لیے ہمیں بھٹو سمیت قائداعظم سے لے کر زرداری تک کے تمام حکمرانوں کے متعلق جو سیاسی لٹریچر دستیاب ہے وہ تعصب یا عقیدت کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم کوئی ایک ایسا خارجی پیمانہ بنا سکتے ہیں جس سے بھٹو سمیت پاکستان کے کسی بھی حکمران کو اس پیمانے پر جانچ کر اس کی غیر جانبدار تصویر پیش کی جا سکے؟

غیر جانبداری بھی ایک خیالی تصور ہے اس لیے ہم اس کو غیر جانبداری کی بجائے پاکستان کے محنت کش طبقے کے نقطہ نظر کی جانب سے دیکھنا کہیں گے۔ جس کا پیمانہ یہ ہے۔

1۔ کسی حکومت کی معاشی پالیسیوں نے کس حد تک پیداواری قوتوں کو آزاد کیا؟

2۔ کیا ترقی عوام کی ضروریات کے مطابق ہوئی یا سامراج کی پالیسیوں کے تابع؟

3۔ ایسی معاشی پالیسیوں سے سماجی ڈھانچے یا سماجی تعلقات پر کیا اثر پڑا؟

4۔ معاشی پالیسیوں نے حقیقی آزادی اور سماجی انصاف کی منزل کو کتنا قریب کیا؟

لیکن یہاں ہم بھٹو کی پالیسیوں پر اس لیے بحث کر رہے ہیں تاکہ ہم ضیاء الحق کے اس مارشل لا کا تجزیہ کر سکیں جس کو لانے کے لیے تحریک نظام مصطفیٰ چلائی گئی۔

بھٹو کی سب سے متنازعہ پالیسی اس کی نیشنلائزیشن تھی جس کو بڑھا چڑھا کر سوشلزم

Sanjh Lok Raj

کا لازمی حصّہ قرار دیا جاتا رہا۔ سوشلزم کی معیشت لاگو کرنے کے لیے نیشنلائزیشن تب ہوتی اگر صنعتی یونٹوں کا کنٹرول ٹریڈ یونینوں کے سپرد کیا جاتا مگر یہاں جو کچھ ہوا اس کو بیوروکریٹائزیشن کہنا پڑے گا۔

جن ممالک میں نیشنلائزیشن میں ذرا بھی وطن پرستی کا عنصر شامل ہوتا ہے وہاں سب سے پہلے غیر ملکی سرمایہ کو قومی تحویل میں لیا جاتا ہے مگر جنوری 1972ء میں جو نیشنلائزیشن ہوئی کسی غیر ملکی کمپنی کو قومی تحویل میں نہیں لیا گیا۔ مارچ 1972ء میں تجارتی بنک نیشنلائز کیے گئے تو ان تمام صنعتی یونٹوں، بیمہ کمپنیوں اور بنکوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا جن میں غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے غیر ملکی سرمائے کو زبانی تحفظ حاصل تھا مگر بھٹو نے 1976ء میں ایک قانون ''بیرونی نجی سرمایہ کاری ایکٹ'' کے ذریعے انھیں قانونی تحفظ فراہم کیا جنوری/مارچ 1972ء میں جو صنعتیں بیوروکریسی کی تحویل میں دی گئیں ان سے ایوب دور کے 22 خاندان اور اجارہ دار گروپوں پر کاری ضرب لگی۔ مگر کیا یہ سوشلزم تھا؟

1975-76 کی سرکاری دستاویز اکنامک سروے کے مطابق ''ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان میں کافی یونٹ غلط معاشی مفروضوں کی بنیاد پر وجود میں آ گئے تھے۔ بدانتظامی کی بنا پر بہت سی کمپنیوں کا دیوالیہ نکل چکا تھا کیونکہ ان کے مجموعی خسارے پیدا شدہ سرمائے سے تجاوز کر گئے تھے انھیں اس صورتحال سے بچانے کے لیے معاشی اصلاحات کا حکم نامہ جنوری 1972ء میں جاری کیا گیا۔''

نیشنلائزیشن کی اس پالیسی نے ضروری بنا دیا تھا کہ ان گنت صنعتی یونٹوں کا انتظام چلانے کے لیے بیوروکریٹس کی خدمات حاصل کی جائیں، چنانچہ 1973ء اور 1977ء کے درمیان بیوروکریسی کے کردار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ سرکاری سیکٹر میں بڑے پیمانے پر ہونے والی اس دوران سرمایہ کاری نے بھی بیوروکریٹس کا اثر ورسوخ بڑھا دیا۔ یاد رہے کہ یہ زیادہ تر وہی صنعتیں تھیں جنھیں پہلے ہی سرکاری سرپرستی اور قرضوں سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ اسی حکم نامے کے تحت تین ہزار سے زائد ایسی فیکٹریاں بھی بیوروکریسی کی تحویل میں دے دی گئیں جو معاشیات کی کسی بھی تعریف کی رو سے صنعت کے زمرے میں نہیں آتی تھیں۔ ان میں فلور ملیں، دھان چھڑنے کی چکیاں اور کپاس بیلنے کی مشینیں بھی شامل تھیں۔ اسی طرح شوگر

Sanjh Lok Raj

ملیں اور گھی کے کارخانے جو زرعی سرمایہ داری کی ابتدائی شکل ہوتے ہیں انھیں بھی بیوروکریسی کی تحویل میں دے دیا۔

اس سے پیداواری صلاحیتیں کس قدر متاثر ہوئیں اِن کو ہم عالمی بنک کے ایک گوشوارے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مالی سال	برآمدات	درآمدات	توازن
1972-73	812.3	792.2	20.1
1973-74	1,026.4	1,370.6	244.2
1974-75	1,251.0	2,607.0	1,356.0
1975-76	1,100.0	2,191.0	1,091.0

درآمدات بڑھنے کا مطلب ہے ملکی پیداوار کا ضرورتوں سے کم ہونا۔ درآمدات بڑھنے کا مطلب ہے تجارتی خسارہ۔ تجارتی خسارہ پورا کرنے کے لیے آئی ایم ایف کے قرضوں پر انحصار اور قرضوں پر انحصار کا مطلب ہے سامراج کی شرطیں اور غلامی۔

ایسی معیشت رکھ کر بھٹو آزاد خارجہ پالیسی اپنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے شمالی کوریا اور شمالی ویت نام کو تسلیم کر کے دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی امریکہ کی غلامی سے آزاد ہے۔

بھٹو کے قریبی ساتھی اور سابق سپیکر قومی اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ''جناب بھٹو اسلامی ممالک کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھنے کے متمنی تھے اور اس کے ساتھ ان کا دفاع مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ ایٹمی طاقت کے حصول کو عالم اسلام کے مجموعی مفاد کے تناظر میں دیکھتے تھے۔ وہ ایٹم بم کے لیے اسلامی بم کی اصطلاح اس لیے استعمال کرتے تھے کہ پورے عالم اسلام کو اس کا نفسیاتی فائدہ ہو۔ بھٹو کی تحریک پر عربوں کی جانب سے مغرب کے خلاف تیل کے ہتھیار کی کامیاب آزمائش کے بعد پاکستان کی طرف سے ایٹمی طاقت کا حصول امریکہ کے لیے ایک خطرے کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہنری کسنجر نے انھیں کہا کہ ہم آپ کو تاریخ کی ایک خوفناک مثال بنا دیں گے۔''

Sanjh Lok Raj

جاگیردار طبقہ پر بھٹو نے زرعی اصطلاحات کی تلوار مسلسل لٹکائے رکھی۔ مگر کبھی پھینکی نہیں اس وجہ سے جاگیردار طبقہ بھٹو سے خوفزدہ رہا۔ مگر آہستہ آہستہ جاگیرداروں کی اکثریت نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ کالونیل جاگیردار طبقہ زیادہ دیر تک اقتدار سے دور نہیں رہ سکتا کیونکہ اقتدار سے دور رہنے کی وجہ سے تھانہ ان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ تھانہ ان کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے رعایا پر اُن کا کنٹرول ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ رعایا پر حکمرانی قائم رکھنے کے لیے جاگیردار طبقہ مسلسل وفاداریاں بدلتا رہتا ہے۔

ایک طرف بھٹو نے فوج کو منتخب حکومت کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف فوج کو بہت زمینیں الاٹ کیں۔ دفاعی بجٹ میں مسلسل اضافہ کیا۔ افواج پاکستان کے سائز میں بے انتہا اضافہ کیا۔ مشرقی پاکستان میں فوجی شکست پر بحث مباحثہ پر پابندی لگا دی۔ محمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو شائع نہیں ہونے دیا (جس میں مشرقی پاکستان میں شکست کی ذمہ داری کا تعین کیا گیا تھا۔) ہندوستان کے خلاف جنگی جنوں پھیلا کر فوج کی اہمیت اور جواز کو اُجاگر کیا۔

صاحبزادہ فاروق علی سابق سپیکر قومی اسمبلی نے لکھا ہے کہ ''فوجی افسران کی امریکہ میں ٹریننگ کی وجہ سے وہ ملکی معاملات کو امریکی سوچ کے حوالے سے دیکھنے لگے تھے۔ امریکہ نے جی۔ ایچ۔ کیو کے ذریعے ہماری سیاست و ریاست کے معاملات میں دور تک اپنا عمل دخل بڑھا لیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں جمہوریت کا رخ بھی اس کے طے کردہ خطوط پر متعین ہونے لگا۔ (p-258) ان جرنیلوں نے بھٹو کو دباؤ میں لا کر فوجی افسروں کی سول انتظامیہ میں کھپت کا اہتمام کرایا تھا۔ وزیراعظم سیکرٹریٹ تک کے در و دیوار پر انہی جرنیلوں اور ان کے زیر انتظام چلنے والی ایجنسیوں کا قبضہ تھا۔ مارچ 77ء کے انتخابات کا اعلان بھی انہی ایجنسیوں، جرنیلوں اور نوکر شاہی کے مہروں کی مشترکہ سازش کا نتیجہ تھا۔ پھر ان جرنیلوں نے پی پی پی سے ایسے بیسیوں اُمیدواروں کو جماعتی ٹکٹ دلوائے جو جاگیرداروں کی نمائندگی کرتے (p-95) وسیم کی کتاب ''پاکستان میں سیاست اور ریاست'' کے مطابق 1960ء کی دہائی میں جنرل شیر علی اور جنرل عمر جیسے لوگوں نے اسلامی نظریے کے پرچار پر زور دیا تاکہ بائیں بازو کے سیاسی نظریات کے پھیلاؤ کو روکا جائے۔ 47ء سے لے کر 70ء تک کی اس ساری منصوبہ بندی کے

Sanjh Lok Raj

برعکس عوام کو جب اپنے لیے کوئی معاشی پروگرام چننے کا موقع ملا تو ملک کے دونوں حصوں میں لوگوں نے سوشلزم کو ووٹ دیا۔

یہ آزدانہ الیکشن اسٹیبلیشمنٹ پر اتنے بھاری پڑے کہ ان کے نتائج کو تبدیل کرنے کے لیے کیسی منصوبہ بندی کی جاتی رہی۔ بریگیڈیئر صدیق سالک جو کہ مشرقی پاکستان میں تعینات تھے اپنی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں لکھا ہے۔

''مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ان 78 نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا گیا جو عوامی لیگ کے مفرور ہونے سے خالی ہوئی تھیں۔ ضمنی انتخابات کرانے کی ذمہ داری میجر جنرل راؤ فرمان علی کو سونپی گئی۔ انھوں نے اسے دائیں بازو کی ان سیاسی جماعتوں کو نوازنے کا ذریعہ سمجھا جو گذشتہ چند مہینوں سے فوج سے تعاون کر رہی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے جماعتوں کو اپنے اُمیدواروں کی فہرستیں پیش کرنے کو کہا۔ انھوں نے درج ذیل بولی دی:

پاکستان جمہوری پارٹی	46
جماعت اسلامی	44
کونسل مسلم لیگ	26
کنونشن مسلم لیگ	21
نظام اسلام پارٹی	17
کل نشتیں	154

مختلف جماعتوں کی طرف سے 154 سیٹوں کا مطالبہ کیا گیا۔ جب کہ خالی نشستیں 78 تھیں سب کو مطمئن کرنا مشکل تھا۔ یحیٰ خان کا حکم تھا کہ نورالامین کی پاکستان جمہوری پارٹی کو زیادہ سے زیادہ سیٹیں دی جائیں تا کہ وہ مرکز میں مخلوط حکومت بنا سکیں۔''

یہ پیراگراف صرف فوج کے ذہن کی عکاسی کے لیے یہاں درج کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں ہم ذوالفقار علی بھٹو کے دور کو دیکھیں تو یہ ایک سیاسی دور تھا۔ طلبہ تنظیمیں، ٹریڈ یونین پارلیمنٹ، آئین، سوشلزم کا زبانی نعرہ آزاد خارجہ پالیسی یہ ایک سیاسی کلچر کا زمانہ تھا۔ سیاسی کلچر میں کبھی غلامی نہیں پنپ سکتی۔ اندرون ملک اسٹیبلیشمنٹ اور بیرون ملک سامراج اس سے خوش نہیں تھے۔ لہٰذا منصوبہ بندی کی گئی کہ ملک کے سیاسی کلچر کو مکمل طور پر مذہبی کلچر میں تبدیل کر دیا

SanjhLokRaj

جائے۔ معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر اسلام کا لیبل ہو۔ کالونیل معاشی مفادات کا اسلام کی آڑ میں تحفظ کیا جائے تا کہ جو کوئی بھی اس کے خلاف سوچے اسے کافر قرار دے کر اسلامی معاشرے میں زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جا سکے۔ اس حکمت عملی کا نام تحریک نظام مصطفیٰ رکھا گیا۔

سیاسی کلچر میں بحث کا موضوع ہوتا ہے کہ پارلیمانی جمہوریت پاکستان کے حالات کے لیے موزوں ہے یا صدارتی نظام حکومت؟ پارلیمنٹ کی بالادستی اور آئین کی حکمرانی ہو یا فرد واحد کی؟ فوج اور بیوروکریسی منتخب حکومت کے ماتحت ہو یا فوج مستقل حکمران ہو؟ بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کو کیسے ممکن بنایا جائے؟ بجٹ میں صحت اور تعلیم پر کتنا خرچ ہو اور دفاع پر کتنا؟ وغیرہ۔

مذہبی کلچر میں بحث کا موضوع ہوتا ہے کہ جمہوریت چونکہ مغربی طرز حکومت ہے اور غیر شرعی ہے اس لیے ایمان کو سلامت رکھنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ جمہوریت کو ملک سے مستقل دیس نکالا دے دیا جائے۔ پارلیمنٹ کے ممبران کو عوام منتخب کرتے ہیں اور عوام کالانعام (جانور) ہوتے ہیں اس لیے یہ حق امیر المومنین کا ہے کہ اپنی مرضی کے صالحین کا چناؤ کر کے ان کی مجلس شوریٰ تشکیل دے اور زندگی بھر حکومت کرے سیاسی پارٹیوں کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ مسلمان معاشرے میں تو بس دو ہی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان۔ جو لوگ فوجی آمر کے ساتھ ہیں وہ حزب اللہ ہیں اور جو اس کے مخالف ہیں وہ حزب الشیطان۔ اسلامی معاشرے میں آئین کی کوئی گنجائش نہیں خدا کی کتاب کے ہوتے ہوئے کسی دوسری کتاب سے راہنمائی لینا کفر ہے۔

اطاعت امیر ہر مسلمان کا فرض ہے۔ سوشلزم کفر ہے کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے امیر اور غریب کا فرق رکھ کر دنیا قائم کی ہے تو انسانوں کی معاشی برابری اور سماجی برابری کا سوچنا شرک ہے۔ سیکولرازم لادینیت ہے وغیرہ۔

اس ایجنڈا کی تکمیل کے لیے معاشرے کو ایک بڑے آپریشن کی ضرورت تھی اور یہ کام ایک لمبے عرصے کے لیے مسلسل ریاستی جبر کے استعمال ہی کے ذریعے ممکن تھا تب ہی زمانہ حال کو ماضی کے مطابق ڈھالا جا سکتا تھا۔

اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل غلام جیلانی نے

Sanjh Lok Raj

ذوالفقار علی بھٹو کو ایک سیدھے سادھے غیر سیاسی مذہبی جرنیل کو بطور چیف آف آرمی سٹاف تعینات کرنے کی سفارش کی۔ اگلا مرحلہ جنرل ضیاء الحق نے خوشامد اور چاپلوسی سے خود ہی طے کر لیا اور بھٹو نے 12 جرنیلوں کی سینیارٹی کو پامال کرتے ہوئے اُسے یکم اپریل 1976ء کو چیف آف آرمی سٹاف تعینات کر دیا۔

انہی خفیہ ایجنسیوں کے کہنے پر ذوالفقار علی بھٹو نے 7 جنوری 1977ء کو اعلان کر دیا کہ پاکستان میں قومی اسمبلی کے لیے عام انتخابات 7 مارچ اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات 10 مارچ کو عمل میں آئیں گے۔

7 جنوری تک ایک دوسرے کی دشمن حزب اختلاف کی جماعتیں 8 جنوری کو متحد ہو گئیں۔ پاکستانی قومی اتحاد کے نام سے ''نظام مصطفیٰ'' کے قیام کے لیے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے انتخابی مہم کا آغاز کیا۔ یہ تو ساری دنیا جانتی تھی کہ بھٹو کو انتخابی معرکہ میں شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے یہ پہلے ہی سے طے تھا کہ انتخابات کے نتائج کو متنازعہ بنا کر فوج کی مداخلت سے بھٹو کو ہٹایا جائے گا۔ صاحبزادہ فاروق علی اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ ''انتخابات کے حکومتی انتظامات کے مقابل فوج نے ایک متبادل نظام وضع کر رکھا تھا۔ جس کا مقصد پیپلز پارٹی کی انتخابی کامیابیوں کو بعض حوالوں سے متنازعہ بنانا تھا۔''

بالآخر 7 مارچ 1977ء کو قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ قومی اسمبلی کی 200 سیٹوں میں سے 155 ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کو ملیں 36 سیٹیں قومی اتحاد کے حصے میں آئیں مگر قومی اتحاد نے الیکشن میں دھاندلی کا الزام لگا کر صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ 11 مارچ کو قومی اتحاد نے بھٹو کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ یہ تحریک مدرسوں کے طلباء، نیشنلائزیشن سے متاثرہ تاجر پیشہ طبقہ، قومی اتحاد میں شامل پارٹیوں کے کارکنوں نے چلائی۔ لیکن دن بدن اس تحریک کے مطالبات میں تبدیلی آتی چلی گئی اور یہ ایک مذہبی تحریک کی شکل اختیار کر گئی جس کے سیاسی مقاصد فوج کے اقتدار کے ذریعے بھٹو کی معاشی پالیسیوں کی واپسی اور اسلام کی آڑ میں سامراجی عزائم کی تکمیل تھے۔

28 مارچ کو بھٹو نے دوسری ٹرم کے لیے وزیراعظم کے عہدے کا حلف اُٹھا لیا۔ تحریک چل رہی تھی۔ 12 اپریل کو بھٹو نے قومی اتحاد کو مذاکرات کی دعوت دی۔ 19 اپریل کو

Sanjh Lok Raj

پولیس نے احتجاج کرنے والوں پر لاہور میں فائر کھول دیا۔ 21 اپریل کو کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں کرفیو لگا دیا گیا اور فوج بلا لی۔ 5 مئی کو قومی اتحاد نے مذاکرات کے لیے 32 نکاتی ایجنڈا پیش کر دیا۔ بھٹو مسلم ممالک کے دورے پر چلے گئے۔ 3 جون کو شیخ زید بن سلطان اور پرنس خالد کی مداخلت پر قومی اتحاد کو مذاکرات کے لیے رضا مند کر لیا گیا۔ 15 جون کو مذاکرات شروع ہوئے۔ اس دوران بھٹو نے قومی اتحاد کے 31 نکات مان لیے نئے الیکشن کے انعقاد کا فیصلہ ہو گیا۔

4 جولائی کو تفصیلات طے ہو گئیں۔ مگر اس سمجھوتے کو فوج اور خفیہ ایجنسیوں نے سمجھا کہ تحریک ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ 5 جولائی کی رات کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا۔ جنرل ضیاء الحق نے پہلی نشری تقریر میں قوم سے وعدہ کیا کہ 90 دن کے اندر الیکشن کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

90 دن تو ابھی بہت دور تھے اقتدار سنبھالنے کے چند ہی روز میں ضیاء الحق نے ایک ملٹری کونسل تشکیل دی۔ جنرل محمد شریف، جنرل محمد اقبال، جنرل محمد رحیم الدین، ایڈمرل محمد شریف، ایڈمرل کرامت رحمان نیازی، ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان اس کے اراکین تھے جبکہ ضیاء الحق اس کا چیئرمین مقرر ہوا۔ کونسل کے اراکین کی معاونت کے لیے بیوروکریسی کے اعلیٰ افسران کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ابھی 90 دن کا وعدہ بہت دور تھا کہ 6 ستمبر کو ضیاء الحق نے اعلان کر دیا کہ ''پاکستانی افواج نہ صرف پاکستان کی علاقائی سالمیت کی حفاظت کی ذمہ دار ہیں بلکہ اس کی نظریاتی بنیادوں کی حفاظت بھی ان کے ذمے ہے'' اس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ پاکستانی ریاست کا نظریاتی و اسلامی کردار اس کی جغرافیائی اور علاقائی حدود جتنا ہی اہم ہے۔

ستمبر 1977ء میں ہی ضیاء الحق نے زرعی صنعت کی فیکٹریاں (جن میں دھان چھڑنے، آٹا پیسنے اور کپاس بیلنے کے کارخانے شامل تھے) ان کے مالکان کو واپس کر دیں اور چھوٹے انجینئرنگ یونٹس بھی مالکان کو واپس کر دیئے۔

ہائی کورٹ کے اختیارات چھین لیے گئے، بنیادی حقوق ختم کر دیئے گئے۔ فوجی اور شرعی عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ جمہوری نظریات و خیالات کو بنیاد پرستی کی چھری سے ذبح کیا

Sanjh Lok Raj

جانے لگا۔ امریکی سامراج اور بین الاقوامی رجعت پسندی اور بنیاد پرستی کو یکجا کیا گیا۔ انسٹیٹیوٹ آف ڈیویلپنگ اکنامکس کے مطابق ضیاءالحق کے دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1977-1981ء بھٹو کی معاشی اصلاحات کی واپسی، پرائیویٹ سیکٹر کا اعتماد بحال کرنا اور اقتدار پر فوجی قبضے کا جواز فراہم کرنا۔

1982-85ء تحریک مصطفیٰ کے مطلوبہ نتائج کے حصول تک اقتدار کو مستحکم کرنا، سیاسی معاشرے کو مذہبی معاشرے میں تبدیل کرنے کے لیے اقدامات جیسے زمانہ حال کو ماضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے نظام تعلیم میں تبدیلیاں، عبادات کے آرڈیننس جیسے صلوۃ آرڈیننس، احترام رمضان آرڈیننس وغیرہ کا اجراء۔

1985-88ء معیشت کو ریاست کے کنٹرول سے آزاد کرنا، چھٹے پنج سالہ منصوبہ (1983-88ء) کی بنیاد لبرلائزیشن اور ڈی ریگولیشن کی سامراجی پالیسی کے مطابق بنانا اور اس کو اسلامی معیشت کا نام دینا۔

معیشت کو اسلامی اصولوں کے مطابق کرنے کے لیے انوسٹمنٹ ٹرسٹ اور انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان کو ہدایت جاری کی گئی کہ وہ سود کی بجائے (Equity) کی بنیاد پر لین دین کریں۔ سرکاری تحویل میں لیے گئے 7000 بنکوں میں اس کے کاؤنٹر کھولے گئے لیکن نیشنل سیونگ سکیموں میں جن میں سود کا لین دین ہوتا تھا انھیں جاری رکھا گیا۔

20 جنوری 1980ء کو تمام اکاؤنٹس پر 2.5 فیصد زکوۃ کی کٹوتی کا اختیار بنکوں کو مل گیا مگر فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ جن پر سود کا لین دین تھا زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ اس اسلامی معیشت کا نتیجہ یہ نکلا کہ معیشت مشروط سامراجی قرضوں اور بیرون ملک گئے ہوئے محنت کشوں، کاریگروں اور ماہرین کی بھیجی ہوئی رقوم کی بیساکھیوں کے ذریعے قائم رکھ کر ملٹی نیشنل کمپنیوں کو سرمایہ لگانے کی کھلی چھٹی دی گئی۔ 1984-85ء کے اختتام پر پاکستان تقریباً سوا دو سو ارب روپے کا مقروض ہو گیا۔ تجارتی خسارہ 38 ارب تک پہنچ گیا۔ بجٹ کا 76 فیصد دفاع اور بیرونی قرضوں کی ادائیگی پر خرچ ہونے لگا۔ پاکستان کے اندر پیدا ہونے والی اشیاء (بجلی اور گیس) کی قیمتیں اور نرخ بھی عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ مقرر کرنے لگے۔ بیرونی بنکوں اور سرمایہ کاری کے دروازے کھول دیئے گئے۔

Sanjh Lok Raj

1977ء سے 1987ء کی درمیانی مدت میں سول سرونٹس کی تعداد دوگنی ہوگئی تھی۔اس پر مزید یہ کہ بہت سے حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجی افسران کو اعلیٰ سویلین ملازمتوں پر فائز کیا گیا۔ غلام اسحٰق خاں اور اے جی این قاضی سول بیوروکریسی وملٹری گٹھ جوڑ کے سمبل بن کر اُبھرے۔

1980ء میں ضیاء الحق نے 284 کالونیل جاگیرداروں، مذہبی علماء اور صحافیوں پر مشتمل مجلس شوریٰ تشکیل دی۔ یہ امیر المومنین کی مجلس شوریٰ تھی۔ اس کا کام یہ تھا کہ امیر المومنین گاہے بگاہے ان کا اجلاس بلا کر انھیں ذاتی خودغرضی کے فیصلوں سے آگاہ کر کے اسے مشاورت کا نام دے کر زندگی بھر حکومت کرے۔اس طرح جمہوریت کو مستقل طور پر ملک سے بے دخل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔

مگر 1981ء میں پاکستان کی بچی کھچی سیاسی جماعتیں اکٹھی ہوئیں اور تحریک بحالی جمہوریت کے نام سے ایک سیاسی پلیٹ فارم کا قیام عمل میں آیا۔1983ء میں بحالی جمہوریت کی تحریک نے زور پکڑا مگر سندھ کی حد تک یہ تحریک جاری رہی اور ضیاء الحق کو انتخابات کروانے پڑے مگر ان انتخابات میں سیاسی جماعتوں کو حصہ نہیں لینے دیا گیا۔اس طرح امیر المومنین نے غیر جماعتی انتخابات کروا کر صوبائی اسمبلی کی بجائے ایک صوبائی بلدیہ بنائی اور قومی اسمبلی کی بجائے ایک قومی بلدیہ تشکیل دی۔اس قومی بلدیہ نے آٹھویں آئینی ترمیم کے ذریعے1973ء کے آئین کو دفن کر دیا اور فوج بیوروکریسی گٹھ جوڑ کی حکمرانی کی راہ ہموار کی۔ یہ تھے مختصر سے نتائج تحریک نظام مصطفیٰ کے۔1985ء میں پاکستان کی سرزمین سے افغان شب خون مارنے والے مجاہدین کو سی آئی نے 450 ملین ڈالر فوجی اور غیر فوجی امداد بہم پہنچائی اور پاکستان کو ایک ایسی جنگ میں پھنسا دیا جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے کئی دانشور ایوب خاں اور ضیاء الحق کی پالیسیوں کو پاکستان کی کامیاب معیشت گردانتے ہیں۔ زرعی ملک کی ترقی میں بھی صنعت اہم کردار ادا کرتی ہے۔صنعت کاری صرف اس وقت معنی خیز ہوتی ہے جب وہ اشیائے صرف پیدا کرنے کے علاوہ ذرائع پیداوار بھی پیدا کرے جس سے پیداواری قوتیں آگے بڑھیں۔

Sanjh LokRaj

گڈ گورننس

پاکستان میں جنرل ایوب خاں اور جنرل ضیاء الحق کی دو فوجی حکومتوں نے ملک کی مجموعی اقتصادی منصوبہ بندی کو سامراجی مفادات کے دائرے میں رکھا اور گماشتہ سرمایہ داری کو اس انداز سے پروان چڑھایا کہ وہ سوشلزم کا راستہ نہ اپنا لے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے سماجی نشو ونما کے عمل کو روک کر رکھا گیا۔ اپنی پسند کے سیاستدان پیدا کیے گئے۔ مذہبی سیاست کو فروغ دیا گیا تا کہ مذہبی پارٹیاں لوگوں کی توجہ احمدیوں کو کافر قرار دلانے، ناموس رسالت اور دیگر اختلافی مذہبی امور کی طرف رکھیں اور اس دوران سامراج پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل کر اپنی معاشی پالیسیوں کو آگے بڑھاتا رہے۔ اس طرح سیاسی پارٹیاں بھی مذہبی ایشوز کی لپیٹ میں آ کر اپنے سیاسی ایجنڈے کو آگے نہ بڑھا سکیں۔

نظام تعلیم میں اس طرح تبدیلی کی گئی کہ نصاب کو اسٹیبلشمنٹ کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ سرکاری میڈیا کو اسٹیبلشمنٹ کی سوچ کے مطابق رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ایوب خان نے تو آزاد رائے رکھنے والے اخباروں کو سرکاری تحویل میں لے کر اسے بھی اسٹیبلشمنٹ کی خدمت پر مامور کر دیا اور ضیاء الحق کے دور میں تو آزاد رائے رکھنے والوں نے کوڑے بھی کھائے۔

پاکستانی فوج کی دو خصوصیات جو کہ پوری دنیا کی افواج سے الگ ہیں۔ ان میں سے ایک ہے نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اور دوسری ہے پاکستانی افواج کا بڑی بڑی جاگیروں، بزنس کمپنیوں، صنعتوں اور بنکوں کا مالک ہونا۔

سوال یہ ہے کہ نظریاتی سرحدیں کیا ہوتی ہیں؟ اور کیا پاکستانی فوج جغرافیائی

Sanjh Lok Raj

سرحدوں کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہی ہے؟

نظریاتی سرحدوں کو سمجھنے کے لیے ایک مثال کافی ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں افغانستان میں روسی فوجیں تھیں جن کے خلاف پاکستانی فوج اور خفیہ ایجنسیاں امریکہ کے ساتھ مل کر مجاہدین کی مدد کر رہی تھیں۔ اس جنگ میں پاکستانی فوج کو بھاری رقوم مل رہی تھیں۔ اس طرح ساری قوم کو اس جنگ کا حامی بنانے کے لیے کتابوں پر حتیٰ کہ سائنس اور الجبرا کی کتابوں پر جہاد کی آیات اور احادیث درج کی گئی تھیں۔ پھر مشرف کا دور آ گیا تب امریکہ کی افواج افغانستان میں تھیں۔ اس دور میں سائنس تو کیا اسلامیات کی کتابوں سے بھی جہاد کی آیات نکال دی گئیں جس پر مذہبی جماعتیں احتجاج کرتی رہیں۔ اس مثال سے آپ ہماری نظریاتی سرحدوں کا نقشہ بخوبی کھینچ سکتے ہیں۔ فوج کے بزنس، جاگیروں، صنعتوں اور بنکوں کی تفصیل آپ کو عائشہ صدیقہ کی کتاب ''ملٹری ان کارپوریٹڈ'' میں ملے گی۔ پاکستان کی بیوروکریسی بھی اس طرح جاگیردار بھی ہے اور صنعتکار بھی۔ اس لیے فوج اور بیوروکریسی کے سرمایہ کو بیوروکریٹک کیپٹل کہا جاتا ہے۔

بیوروکریٹک کیپٹل کا تقاضا تھا کہ اقتدار میں حصہ مانگے۔ جس کی ابتدا نواز شریف کے دوسرے دورِ حکومت میں ملٹری کی طرف سے نیشنل سیکورٹی کونسل کے منصوبہ سے ہوئی۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل جہانگیر کرامت نیشنل سیکورٹی کونسل کے آئیڈیا کی خوب وکالت کر رہا تھا جبکہ وزیراعظم نواز شریف اس کے خلاف تھا۔ اس تنازعہ کے نتیجے میں ایک سویلین وزیراعظم کے احکامات کے نتیجے میں جنرل جہانگیر کرامت کو مستعفی ہونا پڑا۔ یہ پاکستانی تاریخ کا اہم واقعہ تھا اور سول اداروں کی فوج پر حکمرانی کی طرف ایک قدم بھی۔

1973ء کا آئین ایک پارلیمانی جمہوری آئین تھا جس کے بنانے میں 26 سال فوج اور بیوروکریسی نے رکاوٹ ڈالی۔ یہ پہلا آئین منتخب اداروں کی حکمرانی اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کا آئین تھا۔ ضیاء الحق نے جب 1977ء میں پاکستان کو فتح کیا تو اس نے 1973ء کے آئین کو ایک غیر متوازن آئین قرار دیا اور آٹھویں ترمیم کے ذریعے اختیارات اور اقتدار کا پلڑا اسٹیبلشمنٹ کی طرف جھکا دیا اور پارلیمنٹ کو اسٹیبلشمنٹ کے ماتحت کر دیا۔ پھر منتخب حکومتوں نے اسی آئین کے تحت حکومت کی۔ بالآخر نواز شریف کے دوسرے دور حکومت میں 1997ء میں

Sanjh Lokraj

نواز شریف نے تیرھویں آئینی ترمیم کے ذریعے یہ اختیارات دوبارہ ذوالفقار علی بھٹو کے بعد سول اداروں کے ماتحت کر دیئے۔ مگر سترہویں ترمیم کے ذریعے پرویز مشرف نے آئین کو ایک بار پھر اسٹیبلشمنٹ کے ماتحت کر دیا۔ پاکستان میں ہونے والی آئینی ترامیم کسی عوامی مطالبے کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئیں بلکہ یہ اسٹیبلشمنٹ اور سویلین حکومت کے درمیان اقتدار کا پلڑا اپنی طرف جھکانے کی کشمکش کا اظہار ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی آئینی حکمرانی کی موجودگی میں کٹھ پتلی وزیراعظم بنائے جاتے رہے اور جب بھی کبھی کسی منتخب وزیراعظم نے سویلین اداروں کی بالادستی کی کوشش کی اسے یا تو پھانسی پر چڑھا دیا یا جلاوطن کر دیا گیا۔

پاکستان کے لوگوں نے اپنی نسلوں کو بھوک، غربت، بیروزگاری، جہالت اور علاج کی سہولتوں سے محروم رکھنے کی قیمت پر فوج کو عیش کروائی، اپنی حیثیت سے زیادہ دفاعی بجٹ برداشت کیا، قرضے لے کر فوج پر خرچ کیے۔ کیوں؟ ابتداء ہی سے فوج اور بیوروکریسی نے سوشلزم کا راستہ روکنے کے لیے امریکہ سے دفاعی معاہدے کیے مگر عوام کو اس کا دوسرا چہرہ دکھایا۔ انھیں بتایا یہ گیا کہ ہم یہ سب کچھ ہندوستان کے مقابلے کے لیے صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش میں کر رہے ہیں اس مقصد کے لیے فوج نے ابتدا ہی سے انڈیا دشمنی کی سوچ کو پروان چڑھایا کہ ہندوستان نے ہمیں دل سے تسلیم ہی نہیں کیا اور ہندوستان ہمیں ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ پاک فوج نہ صرف پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کا دفاع کر رہی ہے بلکہ پورے عالم اسلام کا دفاع کرنے کے قابل ہے۔ مملکت پاکستان کسی سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ تو ایک مملکت خداداد پاکستان ہے وغیرہ وغیرہ۔

پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ ہندو دشمنی کی چوسنی لیکر اپنا بچپن گذارتا ہے۔ سکول میں مطالعہ پاکستان، اردو، انگریزی، اسلامیات کے ذریعے اس دشمنی کو مستحکم کرتا ہے۔ اپنے دیگر خیالات کو بھی اس مرکزی خیال کے گرد ترتیب دیتا ہے اور ساری زندگی پاک فوج کے ذریعے دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم لہرانے کا خواب دیکھتا رہتا ہے کیونکہ 1948، 1965، 1971ء کی شکست کو وہ ہماری کمزوری نہیں سمجھتا بلکہ شکست کو دشمن کی چال کا نتیجہ قرار دے کر خودفریبی میں مبتلا رہتا ہے۔ پاکستانی فوج کی مراعات، کاروبار، جاگیریں، بنک، اسلحہ کی خریداری میں کمیشن اپنے ہی ملک کو چار دفعہ فتح کرنا یہ سب ہندوستان دشمنی کے پردے

میں چھپا رہا۔ پاکستان کی سامراج دشمن قوتیں اور ملک میں جمہوریت کو فروغ دینے کے خواہشمند یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کے عوام کی خوشحالی کا راز اس خطہ میں پائیدار امن، ہندوستان سے برادرانہ اور تجارتی تعلقات میں پوشیدہ ہے۔

نواز شریف نے پہل کرتے ہوئے ہندوستان کے وزیراعظم کو پاکستان بلایا اور یہاں فروری 1999ء میں ''لاہور ڈیکلریشن'' کے نام سے امن اور دوستی کو بڑھاوا دینے کے لیے معاہدہ کیا۔

فوج کی خفیہ ایجنسیوں نے جماعت اسلامی کے ذریعے ہندوستان کے وزیراعظم کی لاہور آمد پر ہنگامے کروائے۔ چیف آف آرمی سٹاف کسی تقریب میں شامل نہیں ہوا کیونکہ فوج بھی یہ جانتی ہے کہ ایسے امن اور دوستی کے معاہدے دفاعی بجٹ میں کمی کے مطالبے تک عوام کو لے جا سکتے ہیں۔ امن اور دوستی کی اس فضا کو سبوتاژ کرنے کے لیے پاکستان آرمی نے اپریل 1999ء میں کشمیر کے ضلع کارگل میں کاروائیاں شروع کر دیں پھر مار کھا کر واپس بھی آ گئے۔ نواز شریف کارگل پر رپورٹ شائع کرنا چاہتا تھا یہی بات اس کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنی، امریکہ پہلے ہی نواز شریف سے ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے ناراض تھا۔ 12 اکتوبر 1999ء کو فوجی جرنیلوں نے پرویز مشرف کا طیارہ ہائی جیک کرنے کے الزام میں نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر دیا اور پاکستان کو ہائی جیک کر لیا۔

مشرف کا دور سابقہ فوجی حکومتوں سے الگ قسم کا دور تھا۔ سابقہ فوجی ادوار میں سیاسی حکومتوں کی طرف سے اسٹیبلشمنٹ کے پھیلائے ہوئے جال میں سے اگر کسی ایک تار کو نقصان پہنچتا تو فوجی حکومتیں نہ صرف اس نقصان کا ازالہ کر دیتیں بلکہ انھیں پہلے سے زیادہ مضبوط کر جاتیں۔ ایوب خان اور ضیاء الحق کا دور گماشتہ سرمایہ داری کے فروغ اور پرائیوٹائزیشن، ڈی ریگولیشن کا دور تھا۔ مگر پرویز مشرف کا دور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے عالمی راج کا دور تھا جسے گڈ گورننس کا نام دیا گیا اب ملک میں کوئی معمولی سی صنعت بھی نہیں لگے گی اس کی جگہ غیر ملکی سرمایہ کاری ہو گی۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے راستے میں اگر ملک کی انڈسٹری حائل ہو گی تو اسے ختم کر دیا جائے گا۔ آپ کو صرف فوڈ اور زرعی سرمایہ داری کی صنعت وہ بھی جو کسی نہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی ملکیت ہو گی اس تک محدود رکھا جائے گا۔ پوری دنیا میں جس ملک کو جس چیز

کی برآمد کی اجازت ہو گی یا اس کا پیٹنٹ منظور ہوگا وہی عالمی مارکیٹ میں سپلائی کر سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی وہ مقامی انڈسٹری جو ملٹی نیشنل کمپنی کے راستے کی رکاوٹ بنے گی وہ ختم کر دی جائے گی اور ملک کو مکمل طور پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی منڈی بنا دیا جائے گا اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مال پر ٹیکس یا ٹیرف ایک حد سے زیادہ نہیں لگایا جا سکے گا تا کہ سستی مصنوعات لوگوں تک پہنچائی جا سکیں۔ اور سستی چیزیں خریدنے کے شوق میں ہم مقامی صنعت کے بند ہونے اور اس کی وجہ سے بیروزگاری پھیلنے کا کوئی ملال نہ کریں۔ اس طرح ملک کے اندر سے جو ریونیو اکٹھا ہوتا تھا اس میں جو کمی آئے تو وہ ریاست تعلیم اور علاج کو پرائیویٹائز کر دے تا کہ ریاست پر سے خدمات کا بوجھ ہلکا ہو یہ ہے گڈ گورننس۔

عالمی بنک کی جانب سے ورلڈ ڈیویلپمنٹ رپورٹ 2000ء کے مطابق اسٹیبلشمنٹ کی وساطت سے سامراج کے مقبوضہ ممالک کی خوشحالی کے لیے جو ایجنڈا تجویز کیا گیا اس کے اہم پوائنٹ یہ ہیں۔

1۔ ان ممالک میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی شرائط کو قبول کروا کے، ملٹی نیشنل کمپنیوں کو یہ حق دینا کہ وہ اندرونی ذرائع، وسائل اور خدمات کا بلا روک ٹوک استعمال کریں۔

2۔ ماحولیاتی قوانین کے نفاذ کے تحت پانی، بجلی، مواصلات اور دوسری خدمات کو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سپرد کر دیا جائے تا کہ ''گلوبل کیپٹل'' کا حصول ممکن ہو۔

3۔ غربت کا خاتمہ پروگرام کے تحت فلاحی ادارے بنائے جائیں۔ معاشی استحکام سیکٹر ریفارم کی طرف توجہ دی جائے۔ معاشرتی منصوبوں کے لیے فائدہ مند شمولیت پر زور دیا جائے۔

4۔ گلوبلائزیشن کے ساتھ لوکلائزیشن بھی متعارف کروائی جائے۔ لوکلائزیشن سے مراد ہے کہ مرکزی حکومت تعلیم، صحت، روزگار وغیرہ کی ذمہ داری سے دستبردار ہو جائے اور یہ کام مقامی حکومتیں سرانجام دیں۔ مقامی حکومتیں ان خدمات کو بطور خدمات سرانجام نہ دیں بلکہ منافع کے حصول کے لیے کمپنیاں بن جائیں۔ اپنے شیئرز اور بانڈز دوسری کمپنیوں کی طرح مارکیٹ میں بیچنے کے لیے پیش کریں۔ خدمت کے

Sanjh Lok Raj

سارے نظام کو پرائیویٹائز کیا جائے اور اس کی بڑے خریدار ملٹی نیشنل کمپنیاں ہوں۔

پرویز مشرف نے پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کا جو روڈ میپ دیا اسے اس نے 4 نکاتی لائحہ عمل کا نام دیا۔ جس کا مقصد ترجیحات متعین کرنا تھا، ترجیحات کیا ہیں۔

1۔ معیشت کی بحالی

2 سیاسی ڈھانچہ کی از سرنو تعمیر

3۔ غربت کا خاتمہ

4۔ نچلی سطح تک اقتدار کی منتقلی

یہ دعویٰ غلط ہے کہ مشرف بنیاد پرستی کے ضیاء الحق کے پھیلائے ہوئے جال کو ختم کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔ بنیاد پرستی تو مقروض ممالک کو پسماندہ رکھنے کے لیے سامراجی ہتھیار ہے یہ بنیاد پرستی امریکہ نے سوشلزم کا راستہ روکنے کے لیے پروان چڑھائی تھی پھر افغانستان کی جنگ میں پوری دنیا کے بنیاد پرستوں کو یکجا کیا۔ مشرف تو صرف اس بڑھی ہوئی بنیاد پرستی کو ختم کرنے آیا تھا، جو امریکہ کے لیے خطرہ بن رہی تھی۔ ورنہ 15 جون 2000 ابھی اقتدار سنبھالے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے ایک آرڈر کے ذریعے معطل شدہ آئین کی اسلامی دفعات کو بحال کر دیا۔ اس سے پہلے مئی میں مشرف نے گستاخی رسول کے قانون میں مجوزہ ترمیم کو واپس لے لیا متحدہ مجلس عمل بنوائی اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ 70ء کے آزادانہ انتخابات سے اسٹیبلشمنٹ نے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ عوام اگر آزادانہ فیصلہ کریں گے تو وہ ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کے خلاف جائے گا اس لیے 70ء کے بعد سے 2008ء کے انتخابات تک کے نتائج اسٹیبلشمنٹ پہلے ہی طے کر لیتی تھی۔ اس طرح 2002ء کے انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کو ایک اہم کردار دیا گیا۔ بدلے میں جب مشرف نے آئین کو جب ستر ہویں ترمیم کے ذریعے 18 کروڑ عوام کی منتخب پارلیمنٹ کو اسٹیبلشمنٹ کی مرضی کے تابع کیا تو متحدہ مجلس عمل نے مشرف کا بھرپور ساتھ دیا۔

مشرف نے کالونیل جاگیرداروں ہی پر مشتمل پارلیمنٹ بنائی۔ اگرچہ یہ کالونیل جاگیردار مختلف پارٹیوں کے ٹکٹوں ہی پر منتخب ہو کر آئے تھے۔

Sanjh Lokraj

بیوروکریسی کومشرف دور میں تھوڑا نقصان پہنچا مگر یہ نقصان عالمی بنک کے منصوبے پر عمل درآمد کی وجہ سے پہنچا۔ کیونکہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے عالمی راج کے منصوبہ میں بیوروکریسی کا اس طرح کردار نہیں بننا تھا جس طرح پہلے دو مارشل لاؤں میں بنتا تھا۔ مشرف نے ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر ریٹائرڈ جرنیلوں ہی کو بنائے رکھا اور کئی دیگر کارپوریشنز کے سربراہ بھی ریٹائرڈ جرنیل تھے مشرف دور میں بیوروکریسی اور فوج کے قدرتی اتحاد میں دراڑ پڑ گئی، سول سروسز کا ڈھانچہ از سرنو تعمیر کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں بیوروکریسی اپنے روایتی اختیارات سے محروم ہوگئی اس کی بجائے پالیسی سازی کا اختیار ان شہروں کو مل گیا جن کے پاس بین الاقوامی بنکوں اور مالیاتی اداروں کا تجربہ تھا۔

ایوب خان اور ضیاء الحق کی طرح احتساب کی تلوار مشرف دور میں بھی ان سیاستدانوں کے خلاف لٹکتی رہی جو فوجی حکومت کے ساتھ نہیں تھے۔ سیاستدانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نیشنل اکاؤنٹ بلٹی بیورو کے ڈر کی وجہ سے مشرف کی پناہ میں رہی۔

لیکن مشرف دور میں اسٹیبلشمنٹ کا چوتھا ستون یعنی عدلیہ بیوروکریسی فوج اور کالونیل جاگیرداری سے اپنی راہ الگ کر کے آزادی کی راہ پر گامزن ہوگیا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ گڈ گورننس کے بعد غیر محسوس طریقے سے ملک کی صنعت کو توانائی کے بحران اور دیگر حیلوں بہانوں سے ختم کیا جائے گا۔ تعلیم کو آہستہ آہستہ مکمل طور پر پرائیویٹائز کیا جائے گا۔ سرکاری ہسپتال نام کی کوئی چیز باقی نہیں رکھی جائے گی۔ جیسا کہ ورلڈ بنک کی ورلڈ ڈیولپمنٹ رپورٹ 2000 کے چوتھے نکتہ میں بیان کیا گیا ہے۔

Sanjh Lok Raj

جمہوری انقلاب

جمہوریت کوئی آفاقی چیز نہیں جسے اوپر سے نازل کیا گیا ہو اور نہ ہی ایسا ہے کہ اسے محض عظیم مفکروں کے عظیم ذہنوں نے موقع و محل سے آزاد ہو کر پیدا کیا ہو۔ جمہوریت نے سماجی ارتقاء کے خاص مرحلے پر سماج ہی کی کوکھ سے انقلاب کی صورت میں جنم لیا ہے۔ جس سماج نے اسے جنم دیا ہے اس سماج نے اس کے جنم کی پیڑ بھی سہی ہے۔1694ء میں انگلینڈ میں چارلس اوّل کو شکست دے کر عوام نے ظلِ الٰہی کو چوراہے میں پھانسی پر لٹکا دیا۔ 1779ء میں فرانس میں جمہوری انقلاب جاگیرداروں کی گردن پر ٹوکا چلاتا ہوا نمودار ہوا پھر جمہوری انقلاب مسلسل تبدیلیوں کے عمل سے گذرتا ہوا جمہوری نظام حکومت سے بدل کر طرز زندگی کا روپ دھار چکا ہے۔

1900ء تک دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی ایسی چیز کا وجود نہیں تھا جسے ہم آج 2011ء میں جمہوریت کہتے ہیں۔ یعنی ایسی حکومت جسے ہم لوگ انتخاب کے ذریعے سامنے لاتے ہیں اور ان انتخابات میں ہر بالغ شہری اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ پچھلی ایک صدی میں اس واحد رجحان نے عالمی حالات کو متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جمہوریت کسی بھی مسئلے کو جنم نہیں دے سکتی۔ اس لیے ہم جب اپنے اردگرد سماجی، سیاسی، معاشی مسائل کے انبار دیکھتے ہیں تو ان کا تجزیہ کرنے سے آنکھیں چراتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ جمہوریت کا سیاسی نظام سرمایہ دارانہ معاشی نظام کا اوپری ڈھانچہ ہے نہ کہ خود کوئی معاشی نظام اور یہ کہ ہر چار سال بعد الیکشن کروا دینے کا نام جمہوریت نہیں ہے۔

Sanjh Lok Raj

جمہوریت کے کسی ایک یا دو پہلوؤں پر تنقید کا مطلب جمہوریت کی افادیت کا سرے سے انکار نہیں ہے۔ ہم میں سے کون ایسے دور میں واپس جانا چاہے گا جب فرد کے پاس بہتر زندگی کے مواقع کم تھے اور وہ نیم غلامی کی مجبور زندگی بسر کر رہا تھا؟

بس غیر جمہوری ہونے کے الزام کے خوف سے ہم جمہوریت پر تنقید نہیں کرتے کیونکہ یہاں پر یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ جمہوریت کے کسی بھی پہلو پر تنقید آمریت کی حمایت کے مترادف ہے۔ لیکن ہم نے جمہوریت کے ساتھ انقلاب کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے تا کہ یہ سمجھا جا سکے کہ پاکستان سماجی تبدیلی کے کس مرحلے پر ہے۔ یعنی پاکستانی سماج انقلاب کے کس دور میں ہے۔ کیا یہاں جمہوری انقلاب مکمل ہو چکا ہے؟

انقلاب ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی کا نام ہے۔ اس تعریف کے مطابق انڈے کا چوزے میں تبدیل ہو جانا بھی انقلاب ہے۔ چوزہ انڈے کے اندر ہی نشوونما پاتا ہے مگر جب انڈے کا خول اس کی مزید نشوونما میں رکاوٹ بنتا ہے تو وہ خول کو توڑ دیتا ہے اور باہر نکل آتا ہے لہٰذا خول توڑ کر باہر نکل آنا انقلاب ہے۔ تبدیلی کے اس عمل کو جسے ہم انقلاب کہتے ہیں روز مرہ کی ایک اور مثال سے سمجھتے ہیں۔ مادہ تین ظاہری حالتوں میں پایا جاتا ہے۔ ٹھوس، مائع اور گیس۔ پانی ایک ایسی مادی چیز ہے جس کا وجود تینوں حالتوں میں ممکن ہے۔ برف ایک ٹھوس چیز ہے اس پر ٹھوس اشیاء پر لاگو ہونے والے مادی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً ٹھوس اشیاء کا ایک خاص حجم اور خاص شکل ہوتی ہے، جبکہ پانی ایک مائع چیز ہے اس پر ٹھوس چیزوں پر لاگو ہونے والے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا، نہ ہوسکتا ہے کیونکہ پانی کا حجم تو ایک مستقل چیز ہے مگر وہ ہر اس برتن کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں رکھا جائے۔ اس طرح بھاپ ایک گیس ہے جو حالت کے لحاظ سے ٹھوس اور مائع سے مختلف ہے اور اس پر دونوں سے الگ قسم کے مادی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ گیس کی نہ کوئی خاص شکل ہوتی ہے نہ ہی حجم۔

پانی کی مائع حالت کا بھاپ کی حالت میں تبدیلی ایک بتدریج عمل ہے اور اُبلنا اس تبدیلی کا اظہار۔ جب ہم پانی سے بھرے ہوئے برتن کو آگ پر رکھتے ہیں تو وہ فوراً ہی اُبلنے نہیں لگ جاتا بلکہ باہر سے آہستہ آہستہ گرمی جذب کرتا رہتا ہے اور درجہ حرارت بڑھتا رہتا ہے۔ اس بتدریج تبدیلی کے عمل کو کمیتی تبدیلی (Quantitaive Change) کہتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

پھر جب درجہ حرارت100c پر پہنچتا ہے تو سارا پانی اُبلنے لگتا ہے اور پانی کی مائع حالت بھاپ میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اسے کیفیتی تبدیلی (Qualitative change) کہتے ہیں اور یہ کیفیتی تبدیلی ہی انقلاب کہلاتی ہے۔ارتقاء ایک غیر محسوس مگر آگے بڑھتی ہوئی تبدیلی کا نام ہے مگر یہ تبدیلی بڑھتے بڑھتے جب کسی شے کی کیفیت، ماہیت اور ساخت بدل دے تو یہ انقلاب ہے۔ آیئے اس کا اطلاق ہم سماج پر کریں اور دیکھیں کہ سماج کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیاں کس طرح کمیتی تبدیلیوں سے انقلاب کی طرف جاتی ہیں۔ جاگیرداری عہد میں زمین زندگی کا محور تھی۔ زمین کی ملکیت دولت وحشمت اور طاقت کا سرچشمہ تھی۔ جاگیرداری سماج ایک طبقاتی سماج تھا جو جاگیردار اور مزارع میں بٹا ہوا تھا اس سے قبل جب سماج غلامی کے دور سے جاگیرداری کے دور میں داخل ہوا تھا تو غلام درانتی، ہتھوڑا، ہل اور دیگر آلات پیداوار کے مالک تو بن گئے تھے مگر ذرائع پیداوار یعنی زمین کے مالک نہ بن سکے۔ یہ سماج سیاسی لحاظ سے آقا اور غلام سے بدل کر اب جاگیردار اور رعایا میں بٹ گیا ہوا تھا۔ ان پیداواری تعلقات نے جاگیرداری عہد میں جن خیالات کو جنم دیا وہ خیالات خواہ کائنات سے متعلق ہوں یا سماج سے، سیاسی نظام سے متعلق ہوں یا فرد کی سماجی حیثیت سے، اُن کو اپنے اپنے علاقے میں موجود مذہبی خیالات کے تابع رکھ کر ترتیب دیا جاتا تھا۔ جاگیرداری عہد میں چونکہ پیداوار کا انحصار قدرت پر تھا اس لیے معاشرے کی پیدا کی ہوئی ہر چیز خواہ وہ زبان ہو یا ثقافت، معاشی نظام ہو یا سیاسی انتظامی ڈھانچہ، انسان کی سماجی حیثیت ہو یا امیری غریبی، ذات پات ہو یا موسمی تبدیلی، سب خدا کا پیدا کیا ہوا سمجھا جاتا تھا۔ مظاہر فطرت اور سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی تشریح حاکم طبقے کے مذہب کے حوالے سے کی جاتی تھی۔ انسان کو کائنات، اپنی ذات یا سماج میں کسی قسم کی تبدیلی کے معاملے میں بے بس ثابت کیا جاتا تھا حاکم طبقے کے مذہب سے تعلق رکھنے والے مذہبی پیشوا جاگیرداری کا محافظ ادارہ تھے۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، سپین اور پرتگال کے بحری تاجروں نے جب دور دراز علاقوں ہندوستان، لنکا، انڈونیشیا، افریقہ اور امریکہ میں تجارت کے ذریعے رسائی حاصل کی اور پھر بندوق کی نوک پر انھیں غلام بنا لیا تو غلام ممالک کو لوٹنے اور وہاں سے سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے یہ ممالک آپس میں میدانی اور بحری جنگیں بھی لڑتے رہے اور ممالک میں اپنی تجارتی معیشت کی

بنیادیں بھی استوار کرتے رہے۔ اس طرح مقبوضہ ممالک سے جو سرمایہ اکٹھا ہوتا گیا اس سے یورپی ممالک میں صنعتکاری کے لیے راستہ ہموار ہوتا گیا۔ مشین کی پیداوار نے چیزوں کے ڈھیر لگا دیئے جس سے اندرونی اور بیرونی تجارت میں اضافہ ہوا۔ اس وقت علاقے کے جاگیرداروں نے تجارت پر ناجائز اور بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ پیداوار کو مزید بڑھانے اور منافع کمانے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت بھی تھی۔ شہروں میں آبادیاں کم تھیں دیہات کے مزدور اور کسان جاگیرداروں کی رعیت تھے جو ان کی اجازت کے بغیر نقل مکانی نہیں کر سکتے تھے چنانچہ جاگیرداری کے بطن سے پیدا ہونے والی نئی پیداواری قوتوں کے لیے پرانے پیداواری خول کے اندر ترقی اور نشوونما کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ سرمایہ داروں نے اس صورت حال کو اپنے حق میں بدلنے کے لیے کسانوں کو آزاد کروانے اور ٹیکسوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے آزادی، مساوات اور حق نمائندگی کے نعرے بلند کیے اور مزدوروں کسانوں کو اپنے ساتھ ملا کر وہ انقلاب برپا کیا جسے جمہوری انقلاب کہتے ہیں۔

سرمایہ داری عہد میں پیداوار کا محور مشین بنی تو دو نئے طبقے وجود میں آئے صنعت کار اور مزدور۔ سرمایہ داری نظام نے پیداواری ذرائع میں دور رس تبدیلیاں کر کے انسان کے مفاد میں قدرت کی تسخیر کے بے پناہ مواقع فراہم کیے۔ سرمایہ داری کو نشو ونما نے نئے اوزاروں اور پیداواری طریقوں سے مطلوبہ پیداوار حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی، توانائی کے ذرائع دریافت کیے، بیماریوں پر کنٹرول حاصل کیا، تعلیم کا باقاعدہ بندوبست کیا۔ سرمایہ داری پیداواری تعلقات نے انسان میں احساس پیدا کیا کہ یہ کائنات انسان کے تابع ہے۔ جاگیرداری عہد کے انسان کے فطرت، قدرت اور سماج کے سامنے بے بس ہونے کے خیالات کی بجائے سرمایہ داری عہد نے انسان کے فطرت، قدرت اور سماج پر قادر ہونے کے احساس کو جنم دیا۔ یہ احساس پیدا کیا کہ ہم نہ صرف اپنی ذات میں بلکہ سماج میں بھی تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ نئے پیداواری تعلقات نے جن خیالات کو جنم دیا ان خیالات نے اداروں کی شکل اختیار کر کے سرمایہ دارانہ جمہوریت کا ریاستی نظام متعارف کروایا اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کو فروغ دیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوری انقلاب عبارت ہے زمیندارانہ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے سے، جاگیرداری عہد کے پیداواری رشتوں پر سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی فتح

Sanjh Lokraj

اور اس کے ساتھ ہی اس کے اوپری ڈھانچہ کے آمرانہ اور غیر جمہوری اداروں کے خاتمے سے، جمہوری انقلاب عبارت ہے سرمایہ دارانہ طبقے کی جاگیردار طبقے پر فتح سے۔ جاگیرداری عہد کی ثقافت، تہذیب وتمدن، عادات وخصائل کی بیخ کنی اور سرمایہ دارانہ تہذیب وتمدن کی کامیابی سے، جاگیرداری عہد کی خود کفالت، جمود اور علیحدگی کی پسپائی اور نئے قومی تشخص کی نشوونما سے، جمہوری انقلاب سرمایہ دار طبقے کی راہنمائی میں برپا ہوتا ہے۔ یہ انقلاب مطلق العنانی ختم کر کے سرمایہ دارانہ جمہوریت کو قائم کرتا ہے۔

جمہوری انقلاب کے بعد تاریخ نے دنیا کے ممالک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک وہ ممالک جن میں جاگیرداری کا خاتمہ اندر سے اُٹھنے والی قوتوں نے کیا اور دوسرے وہ جن میں جاگیرداری یا بادشاہت کا خاتمہ سامراجی طاقتوں نے کیا۔ برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش (جو کہ اس وقت ایک ہی ملک تھا) میں بھی عین اس وقت جب جاگیرداری عہد کی کوکھ میں سرمایہ داری نظام کی پیدائش کے لیے حالات وجود میں آ رہے تھے برطانوی سامراج نے عیاری، سازش اور اپنی ترقی یافتہ پیداواری قوتوں کے بل بوتے پر قبضہ کر لیا۔ ان ممالک کے سماج کی کوکھ میں نشوونما پانے والی نئی پیداواری قوتوں کو اپنی استحصالی پالیسیوں کے ذریعے تباہ و برباد کر دیا۔ اور عوام پر جاگیرداری استبداد کے ساتھ ساتھ سامراجی استبداد کو قائم کیا۔ اپنی معاشی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے پورے معاشرے کی ساخت کو زراعت پر جامد کر دیا۔ فوج بیوروکریسی اور عدلیہ پر مشتمل ایک حاکمیتی ڈھانچہ مسلط کر دیا۔ تاکہ یہ ممالک سرمایہ داری کی منڈی کے طور پر زندہ رہیں، اس لیے جب بھی ہم پاکستان میں جمہوریت یا جمہوری انقلاب کا تجزیہ کریں گے تو پہلے ہمیں اس کی کالونیل حیثیت کو دیکھنا پڑے گا۔

1947ء کی بظاہر آزادی کے بعد انگریز سے ورثہ میں ملی ہوئی اسٹیبلشمنٹ نے پاکستان میں بنیادی اور بھاری صنعت کے قیام کی مخالف کی۔ بھاری سودی اور مشروط سامراجی قرضوں کے ذریعے ترقی کو سامراجی مفادات کے تابع پروان چڑھایا۔ چونکہ اسٹیبلشمنٹ اور اس کا مسلح بازو فوج اس کام پر مامور تھے اس لیے جب کبھی جمہوری حکومتیں سامراج کے متعین کردہ راستے سے ہٹنے لگتیں تو مارشل لاء لگا کر ملک کو دوبارہ سامراجی معیشت کی راہ پر گامزن کر دیا جاتا۔ پاکستان کی پارلیمنٹ کے پاس ملک کو آزاد معاشی ترقی کے سفر پر ڈالنے کی

اجازت نہیں تھی اور نہ ہی وہ آزاد خارجہ وتجارتی پالیسی اپنا سکتی تھی۔ اس لیے منتخب نمائندوں کا کردار ترقیاتی کاموں، علاقوں کے چند لوگوں کو نوکریاں دلانے، بجلی، پانی، گیس کی سہولتیں فراہم کرنے اور تھانے سے بندے چھڑوانے تک محدود رہا۔ جس کی وجہ سے قومی اسمبلی ہمیشہ قومی بلدیہ اور صوبائی اسمبلی ایک صوبائی بلدیہ کا کردار ادا کرتی رہی۔ اب بھی وزیر خزانہ کی تعیناتی عالمی بنک یا آئی ایم ایف کرتا ہے۔ اب بھی بجٹ تجاویز عالمی مالیاتی اداروں کی نگرانی میں ترتیب پاتی ہیں بلکہ اب تو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے عالمی راج کے منصوبہ کے تحت ملک میں موجود تھوڑی سی صنعت کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات پر ٹیکس کم کر کے انھیں سستا کیا جا رہا ہے اور ملکی مصنوعات پر بھاری ٹیکس اور توانائی کے بحران سے ان کا جینا مشکل بنایا جا رہا ہے اس لیے پاکستانیوں کا چند سوالات پر غور کرنا ضروری ہے۔

1۔ کیا سامراجی معاشی پروگرام کو جاری رکھتے ہوئے، پاکستان میں کمزور ترین سرمایہ داری کو پنپنے دینے کے بغیر ہر پانچویں سال الیکشن کروا دینے کا نام جمہوریت ہے؟

2۔ یعنی کیا جاگیرداری پیداواری رشتوں کو قائم رکھتے ہوئے رعایا کو بالغ رائے دہی کے حق کے ذریعے اپنے اپنے علاقے کے جاگیرداروں اور پیروں کو پانچ سال کے لیے اپنے مستقبل کا مالک بنانا جمہوریت ہے؟

3۔ کالونیل معاشی مفادات کے محافظ اداروں فوج، بیوروکریسی، عدلیہ، کالونیل جاگیرداروں کی بالادستی اور اس بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے بنائے گئے قوانین کی موجودگی میں عوام کا اقتدار اعلیٰ کا خواب یعنی جمہوریت ممکن ہے؟

4۔ کالونیل معاشی سسٹم کو تبدیل نہ کر سکنے پر مجبور ملک میں الیکشن کے ذریعے منتخب حکومت اور آمریت کے درمیان کوئی فرق کرنا ممکن ہے؟

5۔ کیا کسی ریاست کا مخصوص مذہبی، سیاسی اور اقتصادی نظام کی ضمانت دینا ''جمہوریت'' کو بے معنی نہیں کر دیتا؟

6۔ کیا پاکستان میں جمہوری انقلاب کے لیے مادی معاشی بنیادیں فراہم کیے بغیر محض عدلیہ کی آزادی اور میڈیا کے ذریعے اس کی تکمیل ممکن ہے؟

SanjhLokRaj

ایسے ممالک جن میں صرف ''جمہوریت'' کو روکنے پر سارا زور صرف کیا جا رہا ہو وہاں سوشلسٹ انقلاب کا خواب کیسے دیکھا جائے؟ یہ ایک الگ بحث ہے کہ پاکستان کا وجود ہی اس لیے قائم کیا گیا تھا تا کہ سوشلزم کا راستہ روکا جا سکے۔ اس کا واحد طریقہ یہ تھا کہ پاکستانی معاشرے کو جاگیرداری پیداواری تعلقات پر جامد رکھ کر اسلام کی بالادستی کے نام پر لوگوں کو جمہوری اور معاشی حقوق سے محروم رکھا جائے۔ پاکستانی قوم کو پاکستانی فوج کی فتوحات کے ذریعے عالمی اسلامی ریاست کے قیام کے خواب دکھائے جاتے رہیں تا کہ وہ اپنی بھوک، بے روزگاری، جہالت، بیماریوں کے لیے کوئی حل سوچنے کی بجائے اپنی تمام تر خوشیوں کو دنیا پر قبضہ کرنے کے خواب کی تکمیل کے لیے قربان کر دیں۔ جہاں آزاد عدلیہ کا چیف جسٹس افتخار چوہدری کہتا ہے کہ عدلیہ پاکستان کو سیکولر ریاست بننے کی اجازت نہیں دے گی۔ جہاں آزاد میڈیا سیاستدانوں کا مذاق اُڑانے، جمہوریت کی تضحیک اور فوج کے پاکستانیوں پر کئے گئے احسانات جتانے پر لگا ہوا ہے۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اسٹیبلشمنٹ اسے جن خطوط پر استوار کر رہی تھی اس کا اظہار قرارداد مقاصد میں ہو گیا تھا۔ پنڈی سازش کیس (1951ء) فوج میں سے ایسے عناصر کو ختم کرنے کا بہانہ تھا جو پاکستانی فوج کے امریکی مفادات کی خاطر استعمال ہونے میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔1954ء میں امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدوں کے نتیجے میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر پابندی لگا دی گئی، حتیٰ کہ ادیبوں اور شاعروں کی تنظیم ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کو ایسا ادب تخلیق کرنے پر سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا جس سے جمہوری اقدار، انسان دوستی اور عالمی امن کو فروغ دیا جا رہا تھا۔ ایسے اخبارات و جرائد کے پریس ضبط کر لیے گئے جن میں محنت کش طبقے کے حقوق کا ذکر ہو۔ اسٹیبلشمنٹ کے ریاستی میڈیا کے ذریعے پھیلائے گئے خیالات سے اختلاف کرنا وطن دشمنی ٹھہرایا گیا۔ صوبائی حقوق مانگنے والوں کو ملکی سالمیت کے لیے خطرہ قرار دیا گیا۔ اسلام کو قیام پاکستان کی بنیاد قرار دیا گیا اور اسلام کے پردے میں سامراجی معاشی مفادات و سامراجی علاقائی حکمت عملی کی حفاظت کی گئی۔ محنت کش طبقے کو بنیادی حقوق فراہم کرنے کی بات کرنے والا رزق کی خدائی تقسیم کا منکر اور خدا کے نظام عدل کا باغی ٹھہرایا گیا۔

Sanjh Lok Raj

وہاں بائیں بازو کے وہ لوگ جو ملک کو معاشی خود کفالت پر گامزن کرنا چاہتے تھے ابتداء ہی سے مشکل حالات میں جدوجہد کر رہے تھے وہ قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے اور پھانسیوں پر لٹکائے جا رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اب ان کے سامنے آگے بڑھنے کا کونسا راستہ تھا؟ ایسے حالات میں بائیں بازو کے بعض حلقوں نے اپنی اپنی سیاسی حکمت عملی کے طور پر دو الگ طرح کی اصطلاحیں اپنائیں۔ جنھیں قومی جمہوری انقلاب اور عوامی جمہوری انقلاب کہا جاتا ہے۔

1960ء میں بین الاقوامی ورکرز اور کیمونسٹ پارٹیوں نے دنیا بھر کے پسماندہ ممالک کے لیے قومی جمہوری انقلاب کا راستہ تجویز کیا تھا۔ پوسٹ کالونیل ریاستوں میں اس کا مطلب تھا ''قومی سرمایہ دار کی قیادت میں جمہوری انقلاب'' جمہوری انقلاب کے بارے میں تو ہمیں معلوم ہے کہ یہ سرمایہ دار طبقے کی قیادت میں یورپ میں برپا ہوئے، مگر قومی جمہوری انقلاب کے لیے قومی سرمایہ دار کی قیادت لازمی ہوتی ہے ایسا مانا جاتا تھا، لیکن سرمایہ دار اور قومی سرمایہ دار میں فرق سمجھے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ فرض کریں کہ ایک پاکستانی اپنے ملک میں ٹوتھ پیسٹ کا کارخانہ لگاتا ہے، اس کی لگائی ہوئی رقم سے پیداوار ہو رہی ہے کچھ لوگوں کو روزگار میسر آ رہا ہے۔ وہ پاکستانی عوام سے کمایا ہوا منافع جمع کر کے ایک اور کارخانہ لگانے کی تیاری میں ہے، وہ سرمایہ دار کہلائے گا پاکستان کی آبادی اس سرمایہ داری کی منڈی ہے۔ اس کی ٹوتھ پیسٹ لوگوں کو 25 روپے میں دستیاب ہے مگر پاکستان کی منڈی میں کسی دوسرے ملک کی ٹوتھ پیسٹ بھی دستیاب ہے، اور اس کی قیمت 15 روپے ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ لوگ سستی ٹوتھ پیسٹ چھوڑ کر مہنگی ٹوتھ پیسٹ خریدیں گے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ اب پاکستانی سرمایہ داری کی منڈی سکڑتی جائے گی اور اس کی جگہ غیر ملکی ٹوتھ پیسٹ لیتی جائے گی۔ دوسری طرف پاکستان کا وزیر خزانہ عالمی بنک نے مقرر کیا ہوا ہے اور وزیر اعظم اور بیوروکریسی نے دوسرے ملک کی ٹوتھ پیسٹ پاکستان میں فروخت کرنے کے لیے بھاری کمیشن لیا ہوا ہے۔ ایسی صورت حال میں پاکستانی سرمایہ دار کے سامنے دو راستے ہیں۔ پہلا آسان راستہ تو یہ ہے کہ وہ اپنی صنعت کو غیر ملکی سستے مال کی یلغار سے اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتا دیکھے اور پلاٹوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دے یا دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ

Sanjh Lok Raj

دوسرے اسی قسم کے سرمایہ داروں کو اکٹھا کرے اور ان کی تنظیم بنائے، سیاست میں حصہ لے، الیکشن جیت کر آئے اور غیر ملکی ٹوتھ پیسٹ پر اتنا ٹیکس لگائے کہ وہ 35 روپے کی ہو جائے تا کہ غیر ملکی ٹوتھ پیسٹ کے مقابلے میں اس کی ٹوتھ پیسٹ سستی ہو اور زیادہ فروخت ہو۔ پھر سارے سرمایہ دار مل کر تمام ان چیزوں کی درآمد پر پابندی لگا دیں جو ان کے ملک میں بن رہی ہوں۔ اس کے لیے پاکستانی سرمایہ دار کو مقامی اسٹیبلشمنٹ اور باہر سامراجی مفادات سے لڑنا ہو گا۔ وہ پاکستانی سرمایہ دار جو ملک کو معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش میں سامراجی مفادات سے ٹکرائے گا اور اندرون ملک سامراجی مفادات کی محافظ اسٹیبلشمنٹ کو سول اداروں کے ماتحت کرنے کی جدوجہد کرے گا وہ قومی سرمایہ دار کہلائے گا۔

قومی جمہوری انقلاب مشروط ہے قومی سرمایہ دار سے تا کہ اس کی قیادت میں جمہوری انقلاب کی تکمیل ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ پاکستان کے معروضی حالات کیا ہیں؟

پاکستان میں سرمایہ دار طبقہ بیورو کریسی کی نگرانی میں بھاری سودی اور مشروط قرضوں کے ذریعے پروان چڑھایا گیا جسے ہر وقت سامراجی بیساکھیوں کی ضرورت تھی جس نے نئے سامراج اور کالونیل جاگیرداروں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے نشوونما نہیں پائی تھی، جو آمریت کے سایہ تلے ترقی کر رہا تھا اور ہر نازک موقع پر اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے قومی جمہوری طاقتوں کے خلاف صف آراء تھا۔ پاکستان میں کسی متوقع انقلاب کے خلاف سامراج اور اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ قومی جمہوری انقلاب کی راہنمائی کیسے کرتا؟ قومی جمہوری انقلاب کا مفروضہ کوئی عملی شکل اختیار نہ کر سکا کیونکہ یہ مفروضہ پاکستانی حالات کے تجزیے کی بنیاد پر قائم نہیں کیا گیا تھا اور محض میکانکی سوچ کا عکس تھا۔

بائیں بازو کے دوسرے عمائدین کا خیال اس کے برعکس تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جس ملک میں سامراج کا سارا زور اس بات پر صرف ہو کہ وہاں معمولی سی قومی سرمایہ داری بھی نہ پنپنے دی جائے یعنی آپ کو تالے جیسے معمولی چیز بنانے کی اجازت بھی نہ ہو۔ جہاں سامراج نے اتنی بڑی فوج اس لیے پال رکھی ہو کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کی بجائے اپنے ہی ملک پر قبضہ کر کے اس کی معاشی ترقی کو سامراجی مفادات کے تابع کرے اور باقی وقت میں سرکاری زمینیں الاٹ کروائے صنعتیں لگانے کے لیے پرمٹ حاصل کرے یا پلاٹوں کا کاروبار کرے۔

Sanjh Lokraj

جہاں جاگیرداری پیداواری تعلقات کو مذہب کے نام پر ریاستی جبر سے قائم رکھا جاتا ہو، جہاں بنیاد پرستی کو فروغ دینے کے لیے نصاب تعلیم کا سہارا لیا جاتا ہو وہاں عوامی جمہوری انقلاب ہی تبدیلی کا واحد راستہ ہے۔عوامی جمہوری انقلاب کا مطلب تھا عوام کی قیادت میں جمہوری انقلاب۔ بائیں بازو کے ان عمائدین کا کہنا تھا کہ پوسٹ کالونیل ریاستوں میں عوام اپنی جدوجہد کے ذریعے جمہوری انقلاب برپا کریں۔ یہاں عوام سے مراد محنت کش طبقہ، وکلا، طلبا، اساتذہ، دانشور، دکاندار، ڈاکٹر وغیرہ الغرض جاگیرداروں، سرمایہ داروں، ریٹائرڈ جرنیلوں اور بڑے بیوروکریٹس کو چھوڑ کر سب لوگ عوام میں شامل ہیں۔سوال یہ تھا کہ کیا ایسا انقلاب عوام کی کسی انقلابی پارٹی کی سیاسی جدوجہد کے بغیر ممکن ہے؟ تو جواب ہے نہیں۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ قومی جمہوری انقلاب کا مرحلہ (جو کہ کسی ملک کی پیداواری قوتوں کی ترقی اور پیداواری تعلقات کو قائم کرنے کے لیے ایک لازمی مرحلہ ہے) کو کیسے طے کیا جائے؟ تو اس سوال کا جواب یہ تھا کہ عوامی جمہوری انقلاب کی اصطلاح ایک جامع اور وسیع اصطلاح ہے۔قومی جمہوری انقلاب اس وسیع اصطلاح کے مطابق عوامی جمہوری انقلاب ہی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن ایسے قومی جمہوری انقلاب کی راہنمائی سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہو گی بلکہ اس مرحلہ کو پبلک سیکٹر کے قیام سے عبور کیا جائے گا۔ان دونوں قسم کے خیالات رکھنے والے بائیں بازو کے عمائدین نے کبھی یہ نہیں کہا کہ عمومی لائن کو من وعن منتر کے طور پر استعمال کیا جائے بلکہ مخصوص لائن ہونے کے باوجود ہر ملک میں حالات مختلف ہونے کی وجہ سے تبدیلی کا راستہ اس وقت کے لوگ اپنے معروضی حالات کے مطابق طے کریں گے۔

Sanjh Lok Raj

بُلّھیا میری بُکل وچوں کسراں نکلے چور
آل دوالے مُلّاں قاضی، میں وچکار کھلوتا
جرم دھرم دا قیدی بن کے پیاں بھار کھلوتا
سچ دا ویری، ڈھڈھ دا کُتا، پہرے دار کھلوتا
گل پیا ڈھول جے لاہونا چاہواں پے جاندا اے شور
بُلّھیا میری بُکل وچوں کسراں نکلے چور
(صابر علی صابر)

کتابیں

1	تاریخی مادیت	ولادی سلاف
2	پاکستان ایک غیر مستحکم ریاست	حمزہ علوی
3	پاکستانی انقلاب کے مسائل	سردار شوکت علی
4	جمہوریت صبر طلب	صاحبزادہ فاروق علی
5	تاریخ پاکستان (58-1947ء)	پروفیسر گنکوفسکی
6	پاکستان میں جمہوریت اور گورننس	طاہر کامران

Sanjh Lok Raj